معارف

اپریل ۲۰۱۸ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰ر روپئے۔ فی شمارہ ۲۵ر روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴ر روپئے
دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰ر روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰ر روپئے
ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰ر روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI
196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN
LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN
Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
✆ (Office Mobile) 09170060782

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری رمنیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلدنمبر ۲۰۱	ماہ رجب المرجب ۱۴۳۹ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۱۸ء	عدد ۴

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

دارالمصنّفین اپنی تاسیس کی ابتدا ہی سے ریاست حیدرآباد کا ممنون کرم رہا ہے۔ علامہ شبلی کے انتقال کے بعد ان کے تین سو روپیہ ماہوار کے وظیفہ کو دارالمصنّفین کے نام منتقل کر کے نظام حیدرآباد نے دراصل دارالمصنّفین کی بقاء اور استحکام کو یقینی بنایا تھا۔ اس کے علاوہ سیرت النبیؐ کی نسبت سے مختلف اوقات میں ریاست سے قابل لحاظ اضافی امداد بھی ملتی رہی۔ حیدرآباد کی اس فیض رسانی کا سلسلہ ملک کی آزادی تک چلتا رہا اور جب یہ بند ہوا تو دارالمصنّفین کو نہایت مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ دارالمصنّفین کے قیام، بقاء اور استحکام میں ریاست حیدرآباد کا کردار بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے اور دارالمصنّفین نے ہمیشہ اس کا پورا اعتراف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر سید محمود صاحب کے انتقال کے بعد مجلس منتظمہ کے صدر کی حیثیت سے خانوادہ آصف جاہی کے چشم و چراغ نواب میر کرامت علی خاں مفخم جاہ بہادر کا انتخاب نہ صرف جذبہ احسان مندی کا اظہار تھا بلکہ ریاست حیدرآباد سے دارالمصنّفین کے پرانے روابط کی تجدید بھی تھی اور جملہ متعلقین ادارہ کے لیے فخر و مسرت کا ایک خاص موقع بھی۔ نواب صاحب آخری نظام دکن میر عثمان علی خاں کے پوتے اور آخری عثمانی خلیفہ سلطان عبدالمجید ثانی کے نواسے ہیں۔ اس عہدہ کے لیے نواب صاحب کا انتخاب ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ اس طرح ان کا دور صدارت کم و بیش ۴۵ سال کے طویل عرصہ پر محیط ہے اور دارالمصنّفین کی تاریخ میں یہ طویل ترین دور صدارت ہے۔ نواب صاحب دسمبر ۱۹۸۹ء میں پہلی اور آخری بار دارالمصنّفین تشریف لائے اور مجلس منتظمہ کی صدارت فرمائی۔ ادھر ایک عرصہ سے نامعلوم اسباب کی وجہ سے انہیں دارالمصنّفین کے معاملات میں دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ نظام فاؤنڈیشن سے ماہانہ ایک ہزار کی گرانٹ بھی بہت دنوں پہلے بند کر دی گئی تھی۔ وہ بیرون ملک مقیم ہیں اور گذشتہ دس برسوں کے دوران ان سے رابطہ کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ اس کے باوجود اکیڈمی پر حیدرآباد کے احسانات کے پیش نظر اس تعلق کو باقی رکھنے کی خواہش تبدیلی کی بڑھتی ہوئی ضرورت پر غالب رہی۔ لیکن اب اس طرح کے اداروں کے ذمہ داروں کے بارے میں حکومت جس طرح کی معلومات کا مطالبہ کرنے لگی ہے، نواب صاحب بہادر سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تکمیل ممکن نہیں تھی اور ادارہ کے نظم و انصرام کے نقطہ نظر سے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس منصب کے لیے نیا انتخاب کیا جائے۔ چنانچہ دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ نے اپنی سالانہ میٹنگ منعقدہ ۲۹/ مارچ ۲۰۱۸ء میں اس منصب کے لیے عالی جناب محمد حامد انصاری، سابق نائب صدر جمہوریہ ہند کا انتخاب کیا۔ ہم شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اس ذمہ داری کو قبول فرمایا اور اس طرح دارالمصنّفین کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

مشرقی یوپی میں ضلع غازی پور میں یوسف پور محمد آباد کا انصاری خانوادہ اپنی شرافت، نجابت اور وجاہت کے لیے معروف رہا ہے۔ عظیم مجاہد آزادی اور رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی عدیم المثال ملی اور قومی خدمات نے اس خاندان کی شہرت و ناموری میں مزید اضافہ کیا۔ جناب محمد حامد انصاری اسی ذی وقار خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں کولکتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کولکتہ اور شملہ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

میں داخلہ لیا جہاں سے پولیٹکل سائنس میں ایم۔اے کیا اور وہیں کچھ دنوں تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔جلد ہی ان کا انتخاب انڈین فارن سروس کے لیے ہوگیا اس لیے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا لیکن علم و دانش سے شغف زندگی بھر قائم رہا۔فارن سروس سے تعلق کا آغاز ۱۹۶۱ء میں ہوا اور انہوں نے ایک لمبے عرصہ تک دنیا کے مختلف حصوں میں امتیاز کے ساتھ سفارتی خدمات انجام دیں۔آسٹریلیا، متحدہ عرب امارات، افغانستان، سعودی عرب اور ایران ان ممالک میں شامل بھی جہاں وہ سفیر رہے۔شرق اوسط میں طویل قیام کے دوران انہوں نے وہاں کی زندگی اور سیاسی اور ملکی حالات کا بہت باریک بینی سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔اس کی وجہ سے ان کو اس خطہ کے بارے میں گہری بصیرت اور مہارت حاصل ہے جو اس موضوع پر ان کی تحریروں سے عیاں ہے۔اس موضوع پر ان کی پہلی کتاب ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔اس کا عنوان ہے Iran Today: Twenty Five Years After the Islamic Revolutiiuon۔دوسری کتاب Travelling Through Confliet: Essays on Politics of West Asia ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔ان کتابوں سے اس خطہ کے بارے میں نہ صرف ان کی گہری بصیرت اور وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ علمی لیاقت اور دانشورانہ فکر و نظر کا پتہ بھی چلتا ہے۔انہوں نے اقوام متحدہ میں ہندوستان کے مستقل نمایندہ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔

ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ان کو اپنی علمی دلچسپیوں کی طرف توجہ دینے کا زیادہ موقع ملا۔۱۹۹۹ء میں انہیں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں سنٹر آف ویسٹ ایشین اینڈ افریکن اسٹڈیز میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔۲۰۰۰ء میں مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا اور اگلے دو سال انہوں نے امتیاز کے ساتھ اس عظیم درس گاہ کی سربراہی کا فریضہ انجام دیا۔اس کے بعد وہ جامعہ ملیہ میں تھرڈ ورلڈ اکیڈمی میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔اسی دوران انڈین نیشنل کمیشن فار مائنارٹیز (NCM) کے چیرمین مقرر ہوئے۔۲۰۰۷ء میں نائب صدر مملکت کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا۔مدت کار ختم ہونے کے بعد اسی منصب کے لیے دوبارہ ان کا انتخاب ہوا۔اس طرح ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۷ء تک مسلسل وہ اس اہم آئینی منصب پر فائز رہے۔ڈاکٹر رادھا کرشنن کے بعد یہ اعزاز کسی اور کو نہیں ملا۔اس منصب کی وجہ سے وہ راجیہ سبھا کے چیرمین، پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن کے صدر نشین رہے۔ان تمام اداروں کو ان کی سربراہی میں ایک نیا وقار اور اعتبار حاصل ہوا۔ان کے عہد میں راجیہ سبھا ٹی وی اپنی معروضی رپورٹنگ اور بصیرت افروز تبصروں کے لیے مشہور ہوا۔

جناب محمد حامد انصاری کو صرف انتظام اور ڈپلومیسی کے میدان میں وسیع تجربہ حاصل نہیں ہے بلکہ وہ اپنی علمی بصیرت، دانشوری، ملکی مسائل پر مضبوط گرفت اور ملی مسائل پر گہری نظر کے لیے معروف ہیں۔انہوں نے اپنے طویل کیریر میں جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے، مختلف النوع ذمہ داریوں کو جس حسن و خوبی سے انجام دیا وہ ان کی متنوع صلاحیتوں کی غماز ہے۔اس منصب پر فائز رہتے ہوئے بھی انہوں نے ملکی مسائل کے ساتھ ساتھ

ہندوستانی مسلمانوں کے مخصوص مسائل کے بارے میں گہرائی سے غور وفکر کیا اور جب بھی موقع ملا پوری بے باکی سے اس پر اظہار خیال کیا۔ اس کے لیے ان کو شدید تنقید اور مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ملی مسائل سے دلچسپی کا یہی جذبہ تھا جس کے زیر اثر انہوں نے شبلی صدی تقریبات میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کے لیے ہماری دعوت قبول فرمائی اور اعظم گڑھ آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ ان کی شرکت کی وجہ سے صدی تقریبات کا افتتاحی اجلاس یادگار حیثیت اختیار کر گیا۔ ان کے بزرگوں میں حکیم عبدالوہاب نابینا اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے علامہ شبلی کے قریبی تعلقات تھے۔ ان کے چچا ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب دارالمصنّفین کے کرم فرماؤں میں شامل تھے۔ اب ان قدیم روابط کی تجدید کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ ان کی رہنمائی میں دارالمصنّفین ترقی کی نئی بلندیوں کو طے کرے گا اور ایک نئے ولولہ سے ان مقاصد کی تکمیل میں سرگرم ہو جائے گا جن کے لیے اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔

جناب عبدالمنان ہلالی نے ۱۹۹۰ء میں شبلی کالج کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے سبک دوشی کے بعد دارالمصنّفین کی خدمت کو اپنا مقصد زندگی بنالیا تھا اور طویل مدت تک جس طرح انہوں نے یہ خدمت انجام دی اس کی توفیق کم لوگوں کو ملتی ہے۔ رضا کارانہ خدمت کا یہ سلسلہ اُس وقت سے اس وقت تک جاری رہا۔ گذشتہ چند برسوں سے پیرانہ سالی اور بیماری کی وجہ سے ان کے لیے معمول کے مطابق کام کرنا مشکل ہو گیا تھا اور انہوں نے کئی بار اس ذمہ داری سے سبک دوشی کی خواہش کا اظہار کیا لیکن ان کی موجودگی ہم سب کے لیے باعث تقویت تھی اس لیے ان کی خواہش کے باوجود یہ تعلق قائم رہا اور وہ ضعف اور بیماری کے باوجود پابندی سے اکیڈمی آتے رہے۔ گذشتہ دنوں ان کی علالت نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ اب ان کا اکیڈمی آنا ممکن نہیں رہا۔ وہ اکیڈمی کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ راقم حروف کی غیر موجودگی میں اکیڈمی کے انتظامی اور دوسرے امور کی نگرانی جوائنٹ سکریٹری کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اکیڈمی سے ان کی بھی عدم موجودگی کی وجہ انتظامی مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ چنانچہ ان کی خواہش اور اکیڈمی کی انتظامی ضرویات کے پیش نظر متبادل انتظام ضروری ہو گیا۔ ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، سابق صدر شعبہ عربی، شبلی کالج مطبوعات کے انچارج کی حیثیت سے گذشتہ دس سال سے اکیڈمی سے وابستہ ہیں۔ یہ وابستگی مکمل طور پر رضا کارانہ ہے۔ ان کی دوسری خدمات کے علاوہ نئے انداز میں کتابوں کی طباعت ان کی محنت اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ محترم ہلالی صاحب کی علالت کے دوران ادھر کئی سال سے ان کی مفوّضہ ذمہ داریاں بھی زیادہ تر وہی ادا کرتے رہے۔ جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے ان کا انتخاب دراصل ان ذمہ داریوں کو قانونی شکل دینے کے مترادف ہے جو وہ پہلے ہی سے انجام دیتے رہے ہیں۔ ہم محترم ہلالی صاحب کی صحت و عافیت کے لیے دست بدعا ہیں۔

ارکان انتظامیہ کی دو خالی جگہوں پر اکیڈمی کے رفیق اعزازی ڈاکٹر جاوید علی خاں صاحب اور جناب امیر احمد صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔ امیر احمد صاحب کا تعلق کیرالہ سے ہے۔ اس خطہ سے منتخب ہونے والے وہ پہلے رکن مجلس انتظامیہ ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام انتخابات کو اکیڈمی کے لیے باعث خیر و برکت بنائے۔ آمین

مقالات

انساب الاشراف میں مدنی روایات سیرت کا جائزہ

کلیم صفات اصلاحی

(۲)

منافقین مدینہ: مدینہ میں گو کہ آنحضورؐ کا پُرزور استقبال کیا گیا تاہم خوش آمدید کہنے والوں کے علاوہ اس شہر میں بہت سے یہود آباد تھے جو اسلام اور آنحضورؐ کے ازلی دشمن تھے۔ انھوں نے اسلام کی مقبولیت دیکھ کر اندر اندر کفار مکہ سے ساز باز کر لی تھی۔ ایک تیسرا گروہ منافقین کا پیدا ہو گیا تھا، یہ لوگ بھی یہودیوں کے ساتھ مل کر اسلام کے خلاف دن رات سازشیں کرتے تھے۔ مکہ میں یہ گروہ نہیں تھا۔ مدینہ میں اوس وخزرج کے نام سے دو مشہور قبائل تھے، زیادہ تر منافقین ان ہی دونوں قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ آنحضورؐ کی مدنی زندگی میں جو پیچیدگیاں، مسائل اور پریشانیاں دکھائی پڑتی ہیں وہ زیادہ تر اسی گروہ منافقین کی پیدا کردہ تھیں۔ بلاذری چونکہ مورخ ہیں اسی لیے انھوں نے تاریخ کے اس اہم پہلو پر خصوصی توجہ دی اور اوس وخزرج کے تقریباً تمام منافقین کا نام بہ نام اور اسلام اور آنحضورؐ کے خلاف ان کی کارستانیوں کا مجملاً ذکر کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ منافقین اوس وخزرج کا اس طرح جامع تذکرہ دوسرے مصادر سیر وحدیث میں نظر سے نہیں گذرا۔ ملاحظہ فرمائیں:

منافقین خزرج: بلاذری نے خزرجی منافقین میں راس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول، جد بن قنبیس، عدوی بن ربیعہ، اس کا بیٹا سوید، قیس بن عمرو بن سہیل، سعد بن زرارہ، زید بن عمرو، عقبہ بن قدیم،

دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

ابوقیس بن اسلت کے نام تحریر کیے ہیں۔

عبداللہ بن ابی کے متعلق لکھا ہے کہ ”**لئن رجعنا الی المدینة لیخرجن الا عز منها الاذل**“ کے الفاظ اسی نے کہے تھے۔سلول ابی کی ماں کا نام ہے،جس کا تعلق خزاعہ سے تھا،آگے عبداللہ بن ابی کے متعلق حضرت انس کی ایک روایت نقل ہے کہ آنحضورؐ نے اس کے انتقال پر نماز جنازہ پڑھانا چاہا اور اس کو پیراہن مبارک دینا چاہا تو حضرت جبریل نے پیراہن مبارک لے لیا اور یہ آیت اتری **و لا تصل علی احد منهم مات ابدا** (توبہ ۹: ۸۴)(۲۷۴) **ان النبی صلی اللہ علیه و سلم اراد ان یصلی علی عبداللہ بن ابی فاخذ جبریل بثوبه و نزلت**۔اس روایت اور قرآن مجید کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آپؐ نے وحی الٰہی کے نزول کے بعد اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی ہوگی۔ لیکن بخاری اور بعض دوسری کتب سیر و حدیث سے ثابت ہے کہ آپؐ نے نہ صرف اپنا پیراہن مبارک عطا کیا بلکہ نماز جنازہ بھی پڑھائی۔حضرت عمرؓ نے دامن تھام لیا کہ منافق کی نماز جنازہ پڑھائیں گے؟ جبکہ اللہ نے آپؐ کو اس کے لیے دعائے مغفرت سے منع فرمایا ہے۔آپؐ نے فرمایا اللہ نے مجھے اس سلسلہ میں اختیار دیا ہے یا مجھے باخبر کیا ہے (یعنی میرے سامنے استغفار و عدم استغفار کا مفہوم واضح کردیا ہے)۔راوی عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ آپؐ نے نماز جنازہ پڑھائی اور ہم نے بھی آپؐ کے پیچھے نماز پڑھی پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ **و لا تصل علی احد منهم مات ابدا** الخ (۱)۔بعض شارحین بخاری نے لکھا ہے کہ استغفار کی بالکلیہ ممانعت اس کے لیے ہے جو حالت شرک میں فوت ہوا۔اس کے لیے نہیں ہے جس نے اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ **النهی عن الاستغفار لمن مات مشر کا لا یستلزم النهی عن الاستغفار لمن مات مظهر الاسلام** (۲) بخاری کی اس مفصل روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت کا نزول ابن ابی کی نماز جنازہ پڑھانے کے بعد ہوا لیکن بلاذری کی نقل کردہ روایت سے متبادر ہے کہ آپؐ نے نماز جنازہ نہیں پڑھائی تاہم بخاری کی روایت زیادہ معتبر ہے۔

مولانا شبلی بھی اسی کے قائل ہیں۔لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے دامن تھام لیا کہ منافق کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں لیکن دریائے کرم کا بہاؤ کون روک سکتا تھا (۳)۔یہی وجہ ہے اس کے بعد کسی منافق کی نماز جنازہ پڑھانے کا ذکر کتب سیرت میں مفقود ہے۔

منافقین اوس: بلاذری نے قبیلہ اوس کے کل ۷۲ منافقین کی نشان دہی کی جن کے نام اس

طرح ہیں جلاس بن سوید بن صامت، حارث بن سوید بن صامت، دری بن حارث، بجاد بن عثمان بن عامر، نبتل بن حارث جس کے بارے میں رسول اللہؐ نے کہا تھا ''جو شیطان کو دیکھنا پسند کرے اس کو نبتل دیکھ لینا چاہیے، **من احب ان ینظر الی شیطان فلینظر الی نبتل** (ص ۲۷۵)۔عبداللہ بن نبتل، باپ کی طرح یہ بھی آپؐ کی باتوں کو منافقین تک پہنچاتا تھا۔قیس بن زید جو جنگ احد میں قتل کیا گیا، ابوحبیبہ بن الازعر (اس کا شمار مسجد ضرار بنانے والوں میں ہوتا ہے) ثعلبہ بن حاطب بن عمرو بن عبد، معتب بن قشیر، جاریہ بن عامر بن مجمع، اس کے لڑکے یزید، زید و مجمع (مسجد ضرار بنانے والوں میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے، مجمع بن جاریہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ قرآن پڑھتا تھا اور لوگوں کو مسجد ضرار میں نماز پڑھاتا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے منافقت کی اسلام کو اپنایا، قرآن کا حفظ بھی کیا) مرجع بن قنیطی، عباد بن حنیف بن واہب (مسجد ضرار بنانے والوں میں اس کا نام بھی ہے)، قرآن کی آیت ''**انما کنا نخوض و نلعب**'' اسی کے بارے میں ہے۔خذام بن خالد، زیاد کے دونوں بیٹے رافع، بشیر، قیس بن رفاعہ الشاعر، حاطب بن امیہ بن رافع بن سوید، بشر بن ابیرق الظفری، یہ شاعر بھی تھا۔ اس کے بارے میں بلاذری نے متعدد مختصر و مفصل روایت نقل کی ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ حسن سے مروی ایک مختصر روایت اس کے بارے میں یہ نقل کی ہے کہ ابن ابیرق نے لوہے کی ایک زرہ چوری کی اور ایک بے گناہ پر الزام لگا دیا۔ چنانچہ اس کے اہل خاندان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کے سامنے اس کی بے گناہی ثابت کی۔ تو اللہ نے یہ آیت **اتاری انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس** سے **و ساءت مصیرًا** تک، پس جب یہ آیات اس کے بارے میں نازل ہوئیں تو وہ مشرکین سے مل گیا اور مکہ میں ایک جگہ رہنے لگا وہاں بھی نقب زنی کی، اللہ نے اس کے سر پر پتھر گرا دیا اور وہی جگہ اس کی قبر ہوگئی۔ **فالقی اللہ علیه صخرة فشدخته فکانت قبره** (ص ۲۷۸)۔ضحاک بن خلیفۃ الاشہلی، قزمان (اس کے بارے میں بلاذری نے دلچسپ معلومات بہم پہنچائی ہیں اور لکھا ہے کہ قزمان احد میں نہیں نکل رہا تھا تو عورتوں نے اس کو عار دلائی اور کہا کہ تم عورت ہو، چنانچہ اس نے تلوار و کمان سنبھالی اور قومی حمیت و محبت میں لڑنے کے لیے نکل پڑا اور کہہ رہا تھا کہ اے اوس والو، لڑو! عار و فرار سے موت بہتر ہے۔ رسول اللہؐ قزمان کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ وہ جہنمی ہے۔ چنانچہ احد کے دن وہ زخمی ہوا، دار بنی ظفر میں لایا گیا،

اس سے کہا گیا، اے ابوالغید اق، جنت کی بشارت قبول کرو، آج تو تم نے خوب داد شجاعت دی، اس نے کہا ''کیسی جنت؟ بخدا میں نے حمیت قومی کی خاطر جنگ کی ہے، ای جنة و اللہ ما قاتلت الا حمیة لقومی۔ (ایضاً) چنانچہ شدت تکلیف سے اس نے خودکشی کر لی، اس کے بارے میں آپؐ فرما رہے تھے کہ ''اللہ نے اس بد بخت و فاجر سے اس دین کی تائید کرائی''، ان اللہ یؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر۔ (ایضاً) ابوعامر عبدعمرو بن صیفی بن نعمان (اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کو نصرانیت ورہبانیت کی جانب میلان تھا، شام اکثر جاتا تھا، اس کو راہب بھی کہا جاتا تھا، جب آنحضورؐ کا ظہور ہوا تو اس نے حسد کیا، مکہ گیا، قریش کے ساتھ مل کر جنگ لڑی، پھر شام گیا وہیں فوت ہوا۔ اس کی میراث کے سلسلہ میں کنانہ بن عبد یا لیل ثقفی اور علقمہ بن علاثہ کے درمیان تنازعہ پیدا ہوا، علقمہ بھی شام میں تھے اور وہیں مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس وقت اسلام نہیں لائے تھے، واپس مدینہ آئے تو آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی (۲۸۲)۔ اس کے علاوہ اور بھی روایتیں نقل کی ہیں، بخوف طوالت ان کی تفصیلات قلم انداز کی جاتی ہیں۔

مسجد ضرار کی بنیاد کفر وتفریق بین المومنین پر رکھی گئی تھی اور اس کے بنیادگزار منافقین تھے، یہی وجہ ہے کہ اللہ نے وحی کے ذریعہ اس کا بھانڈا پھوڑا۔ اور آپؐ کو اس کی حقیقت سے آگاہ فرمایا۔ منافقین نے اسلام کی بیخ کنی کے لیے نہ جانے کیسی کیسی سازشیں کیں، آپؐ کے خلاف ریشہ دوانیوں کا نہایت پرزور سلسلہ شروع کیا۔ مسجد ضرار بھی ان کی انہیں خفیہ ریشہ دوانیوں کا مرکز تھی۔ اسی لیے آپؐ نے اس کو منہدم کرنے کا حکم دیا۔

مسجد ضرار کی تعمیر وانہدام کا واقعہ: مسجد ضرار کی تعمیر کے سلسلہ میں بلاذری نے سعید بن جبیر سے مروی روایت نقل کی ہے کہ بنی عمرو بن عوف نے ایک مسجد تعمیر کی تھی، جس میں آنحضورؐ انہیں نماز پڑھاتے تھے۔ ان کے بھتیجوں بنی غنم بن عوف کے دل میں ان سے حسد پیدا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھی مسجد تعمیر کریں اور آپؐ سے درخواست کریں کہ اس میں بھی آپؐ ہمیں نماز پڑھائیں۔ چنانچہ جب آنحضورؐ ان کے پاس جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو وحی نازل ہوئی ''والذین'' الخ۔ فلما قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لینطلق الیھم اتاہ الوحی۔ (ص ۲۸۲)

آگے روایت میں لکھتے ہیں کہ ہشام بن عروہ نے اس آیت کے سلسلہ میں یہ کہا کہ مسجد ضرار

کی بنیاد سعد بن خیثمہ نے رکھی تھی، اس جگہ لبد نامی عورت اپنا گدھا باندھتی تھی، چنانچہ اہل مسجد نے کہا کہ ہم ایسی جگہ سجدہ کریں گے؟ جہاں گدھا باندھا جاتا ہے۔ ہم الگ مسجد بنائیں گے جس میں ابو عامر ہمیں نماز پڑھائیں گے۔ وہی عامر جو اللہ اور اس کے رسول سے فرار اختیار کر کے مکہ، پھر شام چلا گیا تھا اور نصرانیت قبول کر لی تھی (ص ۲۸۳)۔ آیت کے اس ٹکڑے **لمن حارب اللہ و رسولہ** میں **لمن** سے ابو عامر کی طرف اشارہ ہے۔

آگے مسجد کے انہدام کے متعلق راویوں کا بیان نقل کیا ہے کہ اسی آیت کے سبب جب آنحضورؐ نے مسجد کو منہدم کرنے کے لیے لوگوں کو بھیجا تو کچھ منافق مسجد نبویؐ میں آئے اور وہاں ہنسنے، کھیلنے اور مذاق کرنے لگے، آپؐ نے ان کو مسجد سے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ ابو ایوب قیس بن عمرو کی طرف بڑھے اور اس کا پاؤں پکڑ کر مسجد سے باہر نکالا، عمارہ بن حزم زید بن عمرو جس کی داڑھی لمبی تھی کی طرف لپکے اور اس کی داڑھی پکڑ کر مسجد سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ بنی عمرو بن عوف کے ایک شخص نے دری بن الحارث کو مسجد سے باہر کیا۔ (ایضاً)

اس کے برعکس ابن ہشام نے لکھا کہ آپؐ مدینہ سے کچھ گھنٹوں کے فاصلہ پر ذی اوان میں تھے کہ اصحاب مسجد ضرار آپؐ کے پاس آئے، وہاں سے آپؐ کا قصد تبوک کا تھا ان لوگوں نے آپؐ سے کہا کہ ہم مسجد بنانا چاہتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ آپؐ اس میں نماز پڑھائیں، آپؐ نے فرمایا ابھی میں سفر پر ہوں اور کچھ مصروفیت ہے۔ جب واپس ہوں گے تو تمہارے لیے مسجد بنائیں گے اور اس میں تمہیں نماز پڑھائیں گے، واپسی میں جب آپؐ ذی اوان آئے یا یہ کہ آپؐ کو مسجد کے متعلق معلوم ہوا تو آپؐ نے مالک بن دخشم، بنی سالم بن عوف اور معن بن عدی کے دو افراد اور عاصم بن عدی اور بنی عجلان کے دو افراد کو بلایا اور کہا کہ جاؤ اس مسجد کو جس کو بنانے والے ظالم ہیں منہدم کر دو، **انطلقا الی ھذا المسجد الظالم اھلہ فاھدماہ** (۴) حکم نبوی پر عمل ہوا۔ آگے مسجد ضرار کو بنانے والوں کے نام دیے ہیں، جن کی تعداد بارہ تھی، ملاحظہ فرمائیں:

خذام بن خالد، ثعلبہ بن حاطب، معتب بن قشیر، ابو حبیبہ بن الازعر، عباد بن حنیف، جاریہ ابن عامر، اس کے دونوں بیٹے مجمع بن جاریہ، زید بن جاریہ، نبتل بن الحارث، مخرج، بجاد بن عثمان اور ودیعہ بن ثابت (۵)۔ موخر الذکر تین ناموں کو چھوڑ کر بلاذری کی فہرست منافقین میں سارے نام

موجود ہیں۔

یہود مدینہ: مدینہ میں یہودی قبائل آباد تھے، جس میں بنی نضیر، بنوقینقاع، بنی قریظہ، بنی حارثہ اور بنی عبدالاشہل زیادہ مشہور تھے۔ یہ لوگ بھی آئے دن آنحضورؐ کو تنگ کرتے تھے، جبکہ آنحضورؐ نے شروع شروع میں ان سے امن و امان کا معاہدہ کیا تھا۔ جس کا انھوں نے پاس ولحاظ نہیں کیا اور عہد شکنی کی تو آنحضورؐ نے ان کے خلاف جنگ کی اور انہیں مدینہ سے جلاوطن کر دیا۔ بلاذری نے سیرت کے اس تاریخی پہلو کو بھی اہمیت دی اور مدینہ کے ان عظمائے یہود کی نشان دہی کی جنھوں نے اسلام کو نیست و نابود کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔

یہود بنی نضیر: اس قبیلہ کے درج ذیل ناموں کی نشان دہی کی ہے۔ حی، مالک، ابو یاسر، جدی ابن اخطب، ان کے اور ان جیسے لوگوں کے بارے میں یہ آیت **ان الذین کفروا سواء علیھم أأنذرتھم** سے **عذاب عظیم** تک نازل ہوئی۔ سلام بن مشکم، کنانہ، ربیع، رافع، ابورافع، کعب ابن الاشرف طائی، عمرو کے دونوں بیٹے حجاج، بحری، ابورافع، سعد بن حنیف (جنھوں نے اسلام قبول کیا)۔ رفاعہ بن قیس، فنحاس، جس نے جب یہ آیت ''**واقرضوا اللہ قرضا حسنا**'' سنی تو کہا کہ دیکھو ہم تو محمدؐ کے رب سے زیادہ غنی ہیں، وہ ہم سے قرض چاہتا ہے۔ تو یہ آیت اتری ''**لقد کفر الذین قالوا ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء سنکتب ما قالوا**''۔ محمود بن دحیہ، عمرو بن جحاش، عزیز بن ابی عزیز، نباش بن قیس، سعیہ بن عمرو، نعمان بن اوفی، سکین بن ابی سکین، زید بن الحارث، رافع بن خارجہ، اسیر بن رازم، اس کو رزام بھی کہا جاتا تھا، یہ لوگوں کو آنحضورؐ کے بارے میں برانگیختہ کرتا تھا اور آپؐ کے بارے میں زبان درازی کرتا تھا۔ خیبر میں آپؐ نے اس کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا، اس کے ساتھ چند یہودی بھی قتل کیے گئے۔ مخیریق، یہ اسلام لائے اور آنحضورؐ کے ساتھ جنگ احد میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اس راہ میں مال بھی خرچ کیا، یہ بھی کہا جاتا ہے یہ بنی نضیر میں سے نہیں تھے۔ (ص ۲۸۵)

یہود بنی قینقاع: بنی قینقاع میں درج ذیل یہودیوں کے نام بتائے ہیں۔

کنانہ بن صوبرا یا صوریا، زید بن نصیت، جس نے کہا تھا کہ ''محمدؐ کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس آسمان کی خبریں آتی ہیں، حال یہ ہے کہ اس کی اونٹنی گم ہوگئی اور اس کو پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے؟'' چنانچہ

اللہ تعالیٰ نے نشان دہی کی، وہ ملی۔ کسی درخت سے اس کی لگام باندھ دی گئی تھی۔ سوید، داعس، یہ دونوں منافق تھے، دونوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، مالک بن ابی قوقلی، یہ بھی بظاہر مسلمان تھا آپؐ کی خبریں یہودیوں تک پہنچاتا تھا۔ یہ احبار یہود میں تھا، کہا جاتا ہے کہ مخیریق ان ہی میں تھے۔ (ص ۲۸۵)

یہود بنی قریظہ: اس قبیلہ میں زبیر باطا بن وہب، کعب بن اسد، عزال بن شمویل، سہل بن زید، وہب بن زید، علی بن زید، قردم بن کعب، کردم بن حبیب، رافع بن رمیلہ، رافع بن حریملہ، اس کی موت جس دن ہوئی تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ آج عظیم منافق کی موت ہوئی، **لقد مات الیوم منافق عظیم النفاق**۔ لبید بن اعصم جس کا پیشہ جادوگری تھا، سلسلہ بن ابراہام، بعض لوگوں نے بہرام کہا ہے لیکن ابراہام زیادہ صحیح ہے۔ رفاعہ بن زید بن تابوت، حارث بن عوف، سعیہ بن عمرو۔

یہود بنی حارثہ: اس قبیلہ کے صرف ایک یہودی ابوسنینہ کا نام لیا ہے۔ بنی عبدالاشہل میں صرف یوشع نامی یہود کا ذکر ہے۔ جس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ نبیؐ کی آمد کی بشارت دیتا تھا مگر جب آپؐ کی بعثت ہوئی تو اس کے سوا بنو اشہل ایمان لائے۔ اس کے اور اس قسم کے لوگوں کے متعلق یہ آیت **فلما جآءھم ما عرفوا کفروا بہ** سے **وللکافرین عذاب مھین** تک نازل ہوئی۔

آخر میں راویوں کا بیان نقل کیا ہے کہ آپؐ نے مدینہ کے یہودیوں سے باہم تحریری معاہدہ کیا تھا جس کے شرائط تھے کہ وہ آپؐ کے دشمنوں اور آپؐ پر حملہ کرنے والوں کی مدد نہیں کریں گے۔ اہل ذمہ سے قتال نہ کریں گے، کسی سے جنگ اور کسی پر حملہ نہ کریں گے اور نہ ہی سریہ بھیجیں گے (لیکن انہوں نے عہد شکنی کی) تو اللہ نے درج ذیل آیت نازل فرمائی **اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا** سے **وللہ عاقبۃ الامور** تک۔ آگے ابن عباس اور عروہ سے مروی دو روایتیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا پہلی آیت ہے جو قتال و جہاد کے متعلق نازل ہوئی۔ (۲۸۶)

یہ سورہ حج کی آیت نمبر ۳۹-۴۰ ہے، جس کے متعلق زرقانی نے بھی لکھا ہے کہ امام زہری اس آیت کو پہلی آیت قتال مانتے ہیں (۶)۔ لیکن تفسیر ابن جریر میں ہے کہ قتال کے متعلق سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے **وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم** (۷) (بقرہ ۲:۱۹۰)

اختلف اھل التاویل فی تاویل ھذہ الآیۃ فقال بعضھم ھی اول آیۃ۔ المسلمین بقتال اھل الشرک۔

غزوات وسرایا رسول اللہ ؐ: اصحاب مغازی وسیر نے آنحضورؐ کی جنگی مہمات کو دو ناموں سے ذکر کیا ہے۔ ایک غزوہ جس میں آپؐ نے بہ نفس نفیس شرکت کی، دوسرے سریہ جس میں آپؐ نے بذات خود شرکت نہیں کی۔ بلاذری نے ص ۲۸۷ سے ۳۷۱ تک غزوات، اس کے بعد ص ۳۷۱ سے ۳۸۶ تک سرایا کے متعلق دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ غزوات وسرایا کی تعداد کے سلسلے میں ارباب سیر و مغازی میں اختلاف رہا ہے۔ بلاذری کی پیش کردہ تفصیلات کے مطابق غزوات کی تعداد ۲۷ (۸) اور سرایا ۵۶ (۹) ہے۔ بیشتر غزوات وسرایا کے ذکر میں مہینہ، مقام، سن اور اسباب تحریر کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جس سے ان کی مورخانہ شان کا اندازہ ہوتا ہے۔

بلاذری کے بیان کے مطابق غزوہ ابواء یا وڈان ہجرت کے بارہویں مہینہ صفر میں (ص ۲۸۷)، بواط ربیع الاول ۲؍ہجری (ایضاً)، سفوان ربیع الاول ۲؍ہجری (ایضاً)، ذوالعشیرہ جمادی الآخر ۲؍ہجری (ایضاً، بدر رمضان ۲؍ہجری (ص ۲۸۸)، غزوہ بنی قینقاع شوال ۲؍ہجری (ص ۳۰۸)، سویق ذی الحجہ ۲؍ہجری (ص ۳۱۰)، غزوہ قرقرۃ الکدر محرم ۳؍ہجری (ص ۳۱۰)، غزوہ بنی غطفان بذی امر ربیع الاول ۳؍ہجری (ص ۳۱۱)، غزوہ بحران جمادی الاولی ۳؍ہجری (ص ۳۱۱)، غزوہ احد شوال ۳؍ہجری (ایضاً)، حمراء الاسد یا ۹؍شوال ۳؍ہجری (ص ۳۳۸)، غزوہ بنی نضیر ربیع الاول یا جمادی الاولیٰ ۴؍ہجری (ص ۳۳۹)، غزوہ بدر الآخرہ ذی قعدہ ۴؍ہجری (ص ۳۳۹)، غزوہ ذات الرقاع محرم ۵؍ہجری (ص ۳۴۰)، غزوہ دومۃ الجندل ربیع الاول ۵؍ہجری (ص ۳۴۱)، غزوۂ بنی المصطلق شعبان ۵؍ہجری (ص ۳۴۱)، غزوہ خندق یا احزاب ذی قعدہ ۵؍ہجری (ص ۳۴۳)، غزوہ بنی قریظہ ذی قعدہ یا ذی الحجہ ۵؍ہجری (ص ۳۴۷)، غزوہ بنی لحیان ربیع الاول ۶؍ہجری (ص ۳۴۸)، غزوہ ذی قرد ربیع الاول یا ربیع الآخر ۶؍ہجری (ص ۳۴۹)، غزوہ خیبر صفر ۷؍ہجری (ص ۳۵۲)، غزوہ وادی القری جمادی الآخرہ ۶؍ہجری (ص ۳۵۲)، فتح مکہ رمضان ۸؍ہجری (ص ۳۵۳)، غزوۂ حنین رمضان ۸؍ہجری (ص ۳۶۴)، غزوہ طائف رمضان ۹؍ہجری (ص ۳۶۶) اور غزوہ تبوک رجب ۹؍ہجری (ص ۳۶۸) میں ہوا۔

بدر سے پہلے غزوات: بلاذری نے بدر سے پہلے کے غزوات میں ۴ غزوات ابواء یا وڈان، بواط، سفوان اور ذات العشیرہ کا ذکر کیا ہے۔ غزوہ ابواء کے متعلق لکھتے ہیں کہ ہجرت کے بارہویں

مہینہ کے آغاز صفر میں آنحضورؐ قریش کے تجارتی قافلہ کی تلاش میں نکلے۔ مدینہ سے ۶ میل کے فاصلہ پر یہ دونوں مقام تھے (۱۰)۔ کسی سے ملاقات نہیں ہوئی، مدینہ واپس آئے۔ سعد بن عبادہ خزرجی کو نائب بنایا تھا۔ اس سفر کے دوران پندرہ دن بنوحمزہ کے علاقہ میں گذارے اور ان سے اس بات پر معاہدہ کیا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کسی سے جنگ نہیں کریں گے اور نہ ایک دوسرے کے خلاف کسی کی مدد کریں گے (ص ۲۸۷)۔ علی ان لا یغزوہ و لا یغزونہ و لا یعینوا علیہ احدا (۱۱) بخاری نے اسی غزوہ کو اول غزوات کہا ہے۔ (۱۲)

غزوہ بواط میں ربیع الاول ۲ ہجری میں آپؐ کو اطلاع ملی کہ امیہ بن خلف الجمحی اور قریش کے سو اشخاص وہاں ہیں لیکن وہاں پہنچنے پر کسی سے کوئی تصادم نہیں ہوا۔ سعد بن معاذ اوسی کو اپنا نائب مقرر کیا۔ (ایضاً)

غزوہ سفوان بھی اسی مہینہ میں ہوا۔ آپؐ نے کرز بن جابر الفہری کا تعاقب کیا جس نے مدینہ کی چراہ گاہ پر جو جماء اور اس کے آس پاس علاقہ میں واقع تھی حملہ کیا۔ آپؐ نے زید بن حارثہ کلبی کو اپنا نائب مقرر کیا، بدر کے قریب پہنچ گئے کسی سے سامنا نہیں ہوا تو واپس لوٹ آئے۔ (ایضاً)

غزوات ذات العشیرہ جمادی الآخر ۲ ہجری میں آپؐ قریش کے ایک قافلہ کی مزاحمت کے لیے ڈیڑھ یا دو سو صحابہؓ کے ساتھ نکلے۔ اپنا جانشین ابوسلمۃ بن عبدالاسد المخزومی کو بنایا۔ ذوالعشیرہ پہنچے تو بنومدلج نے آپؐ کی ضیافت اور خوب خاطر تواضع کی۔ و مر ببنی مدلج فضیفوہ و احسنوا ضیافتہ (ص ۲۸۷)۔ معلوم ہوا کہ قافلہ یہاں سے چلا گیا اور کوئی نہیں ملا، حالانکہ دوسرے سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ آپؐ سے بنی مدلج نے صلح و امن کا معاہدہ کیا۔ (۱۳)

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ غزوہ سفوان کے علاوہ ہر غزوہ میں بلاذری نے یرید عیر القریش یا فی طلب عیر لقریش یا لطلب عیر قریش کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کا مقصد قریش کے کارواں کی مزاحمت کرنا تھا۔ یہاں تک کہ بدر کبریٰ کے وقوع کا سبب بھی عام سیرت نگاروں کے مطابق قریش کے قافلہ کو روکنا بتایا گیا ہے۔ خرج صلی اللہ علیہ وسلم الیھا لطلب عیر قریش التی کان القتال یوم بدر بسببھا (ص ۲۸۷)۔ اس سلسلہ میں مولانا شبلی نے جو موقف اختیار کیا ہے اور قرآن مجید کے الفاظ اور مستند احادیث سے جو

مفہوم مستنبط کیا ہے، اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں البتہ خاص ان غزوات کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے یہاں ان کا نقل کردینا موقع کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے۔

''لیکن میں واقعات کا پابند ہوں، رائے اور قیاس سے غرض نہیں۔ اس قدر واقعہ ہے کہ آنحضرتؐ ان مقامات تک گئے اور وہاں کے قبائل سے معاہدہ کیا۔ اس سے آگے مورخین کا قیاس ہے کہ قریش کے کارواں پر حملہ مقصود تھا گو یہ مقصود نہ حاصل ہوسکا، اگر خدانخواستہ کارواں کا لوٹنا ہی مقصد ہوتا تو آنحضرتؐ کو عیاذاً باللہ اس قدر بے تدبیر فرض کرنا پڑے گا کہ ہر مرتبہ ناکامیابی ہوتی تھی اور قافلہ بچ بچ کر نکل جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بار بار کے تجربہ کے بعد بھی بدر میں اس قسم کی ناکامیابی ہوئی اور قافلہ صحیح وسلامت نکل گیا''۔ (۱۴)

مذکورہ بالا غزوات کی تفصیل بلاذری نے مجملاً تحریر کی ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے غزوہ ذات العشیرہ کے علاوہ کسی غزوہ میں صحابہ کرامؓ کی تعداد کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی اس کی وضاحت ملتی ہے کہ ان غزوات میں صرف مہاجر صحابہ تھے یا ان کے ساتھ انصار بھی شریک ہوتے تھے۔ اگر ان میں صرف مہاجرین کی شرکت تھی تو انصار کی عدم شرکت کے اسباب کیا تھے؟ حالانکہ آپؐ مدینہ کے پڑوسی قبائل سے معاہدۂ امن وصلح کرکے اسلام کے تحفظ اور غلبہ کے ساتھ ساتھ مدینہ کی سرحدوں کے تحفظ کو بھی یقینی بنانا چاہتے تھے جو انصاری صحابہ کی جائے پیدائش تھیں۔ ان جنگوں میں عدم شرکت کی وجہ علامہ شبلی نے یہ لکھی ہے کہ ''انصار نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینہ پر چڑھ آئیں'' (۱۵) تو چوں کہ اس وقت تک اس قسم کا کوئی معاملہ سامنے نہیں آیا تھا اس لیے اقرارنامہ کے مطابق انصاری آپؐ کے ساتھ ان غزوات میں شریک نہیں ہوئے۔

غزوہ بدر کی تفصیلات: تاریخ اسلام میں غزوۂ بدر کی بڑی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ حق وباطل کا وہ معرکہ ہے جس کی قرآن کے بیان کے مطابق خود رب کائنات نے ذمہ داری لی۔ جس کے لیے اللہ نے عناصر عالم کو آمادہ مدد کردیا تھا، فرشتوں کی فوجیں بھیجی تھیں، کفار مکہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی تعداد کو اپنے آپ سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔ سورہ انفال کی آیت ۱۷ فلم تقتلوھم و لکن اللہ قتلھم و ما رمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمی سے ظاہر ہے کہ اس میں اللہ کی خصوصی مدد ونصرت

سے فتح ہوئی، البتہ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ عالم اسباب کے لحاظ سے آنحضورؐ نے اصول جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں اور ہتھیاروں سے لیس ایک عظیم الشان لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے جس انداز سے صف آرائی کی وہ آپؐ کے حسن تدبیر و قیادت اور اعلیٰ ترین فوجی نظم کا مظہر ہے۔

بلاذری نے اس اہم غزوہ کی تفصیلات کے لیے تقریباً بیس صفحات مختص کیے ہیں۔لکھا ہے کہ یہ یخلد بن النضر کا کنواں تھا، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جہینہ قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا (ص ۲۸۸)۔بدر اور مدینہ کے درمیان ۸۰ میل کا فاصلہ تھا (ایضاً)۔راویوں کا بیان نقل کیا ہے کہ آنحضورؐ شام سے آنے والے اس قافلہ کی واپسی کے منتظر تھے، جس کے لیے آپؐ ذوالعشیرہ تک نکلے تھے۔قالوا! وتحین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصراف العیر التی خرج لھا الی ذی العشیرہ من الشام (ص ۲۸۸)۔چنانچہ صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ سامانوں سے بوجھل قافلہ قریش آچکا ہے، قافلہ میں ایک ہزار اونٹ ہیں اور اس میں ابوسفیان بن حرب، مخرمہ بن نوفل زہری اور عمرو بن العاص وغیرہ جیسے سرداران مکہ ہیں۔آگے لکھتے ہیں کہ ”وتودون غیر ذات الشرکۃ تکون لکم“ کے مطابق آپؐ کا ان سے متحارب ہونے کا خیال نہیں تھا۔”ولم یظن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ یحارب“ (ص ۲۸۸)۔یہی وجہ ہے کہ ۱۲/ رمضان ۲ ہجری بروز اتوار جب آپؐ مدینہ سے نکلے تو آپؐ کے بعض صحابہ نے آپؐ کے ساتھ چلنے میں سستی کی کیونکہ انہیں جنگ کا خیال نہیں تھا۔وابطأ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوم من اصحابہ اذ لم یحسبوا انھم یحاربون (ایضاً)۔بلاذری نے ان کے یہ نام گنائے ہیں اسد بن حضیر الاوسی، سعد بن عبادہ، رافع بن مالک، عبداللہ بن انیس، کعب بن مالک، عباس بن عبادہ بن نضلہ، یزید بن ثعلبہ ابوعبدالرحمٰن (ایضاً)۔چنانچہ جب آپؐ مدینہ واپس آئے تو اسید نے اللہ کی مدد اور دشمن پر فتح یابی کے لیے آپؐ کی خدمت میں تہنیت پیش کی اور خود پیچھے رہ جانے کے سلسلہ میں معذرت کا اظہار کیا (ایضاً)۔ ھنّأہ اسید بنصر اللہ و اظھارہ ایاہ علی عدوہ واعتذر من تخلفہ اور کہا کہ میں نے سوچا کہ آپؐ کا قصد قافلہ کا تھا، مجھے یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ آپ جنگ کریں گے۔انما ظننت انھا العیر ولم اظن انک تحارب (ص ۲۸۸)

بلاذری نے وہ روایت نہیں لکھی ہے جو غزوہ بدر کے اصل سبب ہونے کی جانب اشارہ کرتی

ہے یعنی آپؐ نے بارہ آدمیوں پر مشتمل ایک جماعت عبداللہ بن جحش کی قیادت میں قریش کے حالات کا پتہ لگانے کے لیے رجب ۲ ہجری میں بطن نخلہ روانہ کی، اتفاق سے قریش کے چند لوگ تجارت کا مال لیے شام سے واپس آرہے تھے، حضرت عبداللہ نے ان پر حملہ کردیا جس میں عمرو بن الحضرمی مارا گیا، دو گرفتار ہوئے اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ یہ لوگ مدینہ واپس آئے، آپؐ نے فرمایا "میں نے تم کو اس کی اجازت نہیں دی تھی"، غنیمت لینے سے بھی انکار کردیا۔ صحابہ کرامؓ نے برہم ہوکر کہا "صنعتم مالم تؤمروا به" تم نے وہ کام کیا جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا (۱۶)۔ اس واقعہ نے تمام قریش کو مشتعل کردیا اور یہ غلط خبر بھی پھیل گئی کہ مسلمان قافلہ کو لوٹنے آرہے ہیں۔ معرکۂ بدر کا سلسلہ اسی واقعہ سے وابستہ ہے، حضرت عروہ بن زبیر نے بھی تصریح کی ہے کہ غزوۂ بدر اور تمام لڑائیاں جو قریش سے پیش آئیں سب کا سبب حضرمی کا قتل ہے۔ كان الذى هاج وقعة بدر وسائر الحروب التى كانت بين رسول الله صلى الله عليه وسلم وبين مشركى قريش فيما قال عروة بن الزبير ما كان من قتل واقد بن عبد الله التميمى عمرو بن الحضرمى۔ (۱۷)

خبیب کا قبول اسلام: خبیب بن اساف کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ اپنی قوم خزرج کی مدد اور مال غنیمت کی طلب میں اس جنگ کا حصہ بننا چاہتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا ہمارے ساتھ وہی جاسکتا ہے جو ہمارے دین پر ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسلام قبول کیا اور خوب داد شجاعت دی (ص ۲۸۸) لا يصحبنا الا من كان على ديننا فاسلم و ابلى۔

وہ صحابہ جو کم سنی کے سبب شریک بدر نہ ہوسکے: عبداللہ بن عمر بن الخطاب، اسامہ بن زید، رافع بن خدیج، براء بن عازب، اسید بن ظہیر، زید بن ارقم اور زید بن ثابت چھوٹے ہونے کے سبب اس کا حصہ نہ بن سکے، عمیر بن ابی وقاص کو کم سنی کے سبب روکا گیا تو رو پڑے، پھر اجازت ملی سعد بن ابی وقاص نے ان کی گردن میں تلوار حمائل کی (ایضاً)۔ طلحہ بن عبیداللہ اور سعید بن زید کو جاسوسی اور خبر رسانی کے لیے بھیجا۔ (ایضاً)

عدم شرکت کے باوجود مال غنیمت پانے والے صحابہ: اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو بوجوہ یا کسی ذمہ داری کے سبب جنگ میں شریک نہ ہوسکے تھے لیکن آپؐ نے مال غنیمت کی تقسیم کے

وقت ان کا خیال رکھا اور ان کا بھی حصہ لگایا۔ان میں طلحہ بن عبیداللہ،سعید بن زید،حضرت عثمان بن عفان (جو حضرت رقیہؓ کی بیماری کے سبب جا نہیں سکے تھے،آپؐ نے ان کا بھی حصہ لگایا)،بسبس بن عمرو،عدی بن ابی الزغبا جہینی (جن کو آپؐ نے اس قافلہ کی خبر گیری کے لیے بھیجا تھا جن میں ۱۳۰افراد تھے۔لیعرفا اخبر العیر و من فیھا من قریش و ھم ثلاثون)،ابولبانہ بن عبدالمنذر (جن کو آپؐ نے مدینہ میں جانشین مقرر کیا تھا)۔عاصم بن عدی (ان کو آپؐ نے قبا اور عالیہ (مدینہ کی بالائی آبادی) پر اپنا نائب بنایا) خوّات بن جبیر (جن کو چوٹ آ گئی تھی)،حارث بن حاطب (جن کو بنی عمرو کے سلسلہ میں کوئی کام دیا تھا)،حارث بن صمہ،یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جعفر بن ابی طالب (کو جو اس وقت حبشہ میں تھے) کا بھی حصہ لگایا اور کچھ الگ سے کسی کام کی اجرت آپؐ نے عطا کی۔(۲۸۹)

بدر میں نہ شریک ہونے والے صحابہ کی تعداد: اس فہرست کے مطابق بدر کے وہ صحابہ جو براہِ راست شریک جنگ نہ تھے ان کی تعداد ۱۱ تک پہنچ جاتی ہے لیکن خود بلاذری کے نزدیک صحیح تعداد ۸ ہے۔طلحہ،سعید،جہینین (یعنی بسبس بن عمرو اور عدی بن الزغبا)،عثمان،ابولبانہ،عاصم بن عدی اور خوّات۔

بدر میں مسلمانوں اور سواریوں کی تعداد: بلاذری کے مطابق بدر میں مسلمانوں کے پاس کل ۷۰ اونٹ تھے،جن پر باری باری لوگ سوار ہوتے تھے۔کبھی دو،کبھی تین اور کبھی چار۔آپؐ،حضرت علی اور زید بن حارثہ ایک اونٹ پر،حمزہ اور ان کے حلیف مرثد بن ابی مرثد،ابو کبشہ،رسول اللہؐ کے غلام انسہ کے لیے ایک اونٹ،عبیدہ،طفیل،حصین بن حارث،مسطح کے درمیان ناضح تھا (یعنی وہ اونٹ جن پر پانی لایا جائے) جس کو عبیدہ بن حارث نے خریدا تھا۔عثمان اور بنی مظعون کے لیے ایک اونٹ تھا۔(ایضاً)

مسلمانوں کے پاس صرف دو گھوڑے تھے،ایک زبیر بن العوام کا اور دوسرا مقداد بن عمرو الہرانی کا جو اسود بن عبد یغوث کے رشتہ دار تھے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گھوڑا زبیر کا نہیں بلکہ مرثد بن ابی مرثد کا تھا (۲۸۹)۔آگے لکھتے ہیں کہ مقداد کے گھوڑے کے باب میں کوئی اختلاف ہے اور نہ ہی اس بات میں کوئی اختلاف ہے کہ مسلمانوں کے پاس صرف دو گھوڑے تھے (ایضاً)۔و لم یختلفوا فی فرس المقداد و لا فی انہ لم یکن مع المسلمین الا فرسان۔

آگے واقدی کا قول نقل کیا ہے کہ شرکائے بدر یعنی ۳۱۴ لوگوں میں آپؐ نے مال غنیمت میں سب کا حصہ لگایا۔ان میں آٹھ صحابہ جنگ میں شریک نہیں ہوئے مگر آپؐ نے ان کا بھی حصہ لگایا۔قال

الواقدی! کان المسلمون الذین اسهم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی غنائم بدر ثلاث مئۃ واربعۃ عشر رجلا منھم الثمانیۃ الذین لم یحضروا افاسھم لھم (ص ۲۸۹)

لکھتے ہیں مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ تھی جن میں ۴۰ افراد قبیلہ قریش کے تھے (۲۹۰)۔ مشرکین ساڑھے نو سو تھے (ایضاً) ان المشرکین کانوا یوم بدرٍ تسع مئۃ و خمسین رجلا۔ آگے سعید بن مسیب سے مروی روایت نقل کی ہے کہ شرکاء بدر کی تعداد ۳۱۴ تھی۔ ان میں ۸۳ مہاجر، ۶۱ افراد اوس اور ۱۷۰ خزرج کے تھے (ایضاً)۔ آگے واقدی کا قول نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک شرکائے بدر کی صحیح تعداد ۳۱۴ ہے۔ البتہ مہاجرین ۷۴ اور بقیہ سب کے سب انصار تھے۔ منھم من المھاجرین اربعۃ و سبعون و سائرھم من الانصار (ص ۲۹۰)

بخاری نے ''باب عدۃ اصحاب بدر'' کے تحت براء سے مروی روایت نقل کی ہے جس کے مطابق ۶۰ سے اوپر مہاجر اور ۲۴۰ سے اوپر انصاری صحابہ تھے۔ اگلی دو روایتوں میں ہے کہ اصحاب بدر کی تعداد وہی تھی جو اصحاب طالوت کی تھی یعنی کل ۳۱۰ سے کچھ اوپر۔ ان روایتوں میں ۳۱۳ یا ۳۱۴ کی متعینہ تعداد موجود نہیں ہے (۱۸) ان عدۃ اصحاب بدر علی عدۃ اصحاب طالوت .... بضعۃ عشر و ثلاث مئۃ۔

قریش کی سواریوں کی تعداد اور ابوسفیان کا راستہ بدلنا اور مدد کی گہار لگانا: قریش کے ساتھ سو گھوڑے، سات سو اونٹ تھے۔ اصحاب خیل سب کے سب زرہ پوش تھے (ص ۲۹۰)۔ ابوسفیان کو آپؐ کی روانگی کی خبر ہوگئی تو راستہ بدل کر قافلہ کو دریا کی جانب سے لے کر روانہ ہوا۔ ضمضم بن عمر الکنانی کو بیس دینار کی اجرت پر مکہ بھیجا، اس نے مکہ پہنچ کر اپنے اونٹ کی ناک کاٹ دی، آگے پیچھے قمیص کو پھاڑ ڈالا اور الغوث الغوث کی صدا لگائی۔ راویوں کا بیان ہے کہ قریش گانے باجے کے ساتھ مسلح ہو کر نکل پڑے۔

ابوسفیان کا جنگ سے منع کرنا: جحفہ تک پہنچے تھے کہ ابوسفیان نے اپنی حفاظت وسلامتی کا پیغام بھیجا اور لکھا کہ محمد اور اہل یثرب سے تعرض کی اب ضرورت نہیں ہے۔ فبعث الی قریش من الجحفہ یعلمھم سلامتہ بما معہ و انہ لا حاجۃ بھم الی التعرض لمحمد و اھل یثرب۔ (ص ۲۹۱) لوگوں نے انکار کیا، ابوجہل نے لوگوں کو ابھارا اور نکلنے کی ترغیب دی، امیہ بن خلف الجمحی نے خروج سے

منع کیا تو ابوجہل مکحل اورعقبہ بن معیط مجمر کے ساتھ امیہ کے پاس آئے۔ ابوجہل نے کہا، سرمہ لگالو اس لیے کہ تم عورت ہو، عقبہ نے کہا جوڑا کرلو اس لیے کہ لونڈی ہو۔ عتبہ بن ربیعہ نے بھی نکلنا پسند نہ کیا اور بھائی شیبہ بن ربیعہ سے کہا کہ ابن حنظلہ یعنی ابوجہل بدقسمت شخص ہے۔ حالانکہ محمد سے قرابت وتعلق کا جو حصہ اس کو ملا ہے ہم کو نہیں ملا ہے۔ و لیس یمسه من قرابة محمد ما یمسنا (ص ۲۹۱)۔ شیبہ نے کہا اگر قریش ہم سے الگ ہوئے اور ہم مکہ لوٹے تو وہ ہمارے خلاف ہوجائیں گے اور ہم کو ذلیل و بے عزت کردیں گے۔ اے ابوالولید ہم کو اپنی قوم کا ساتھ دینا چاہیے۔

بعض وہ قبائل جو راستہ سے واپس ہوگئے: راویوں کا بیان ہے کہ ابی بن شریق ثقفی نے جو بنی زہرہ کا حلیف تھا کہا کہ اے بنی زہرہ اللہ نے تمہارے قافلہ کو بچالیا ہے۔ تم واپس چلے جاؤ۔ چنانچہ کفار بنی زفر میں سے کوئی بدر میں شریک نہیں ہوا۔ و لم یشھد بدرا من کفار بنی زھرة احد (ص ۲۹۱)

راویوں کا بیان ہے کہ عدی بنو کعب بن عدی مکہ سے لوٹ رہے تھے کہ ابوسفیان سے ملاقات ہوئی تو سفیان نے ان سے پوچھا کہ کیسے لوٹے، نہ تو تم قافلہ میں تھے اور نہ ہی لڑنے والوں میں تھے۔ اس جملہ سے بلاذری نے استدلال کیا ہے کہ ان کا بھی کوئی شخص بدر میں شریک نہیں ہوا۔ فلم یشھد بدرا منھم احد (ایضاً)

حارث بن عامر بن نوفل کا بھی بدر میں شرکت کا ارادہ نہ تھا لیکن ابوجہل، عقبہ بن معیط اور نضر ابن حارث نے اس کو بزدلی کا طعنہ دیا، اسی طرح حکیم بن حزام، ابوالبختری، علی بن امیہ بن خلف بھی ان کے طعن وتشنیع کے سبب نکلے، ان کا لڑنے کا ارادہ نہیں تھا (ایضاً)۔ حتی خرجوا و کانوا ارادوا الا یفعلوا۔

کفار قریش نے بدر میں ہر قسم کا تعاون پیش کیا: راویوں کا بیان ہے کہ صاحب ثروت نے کم سرمایہ والوں کو سرمایہ مہیا کیا اور اپنے مال اور سامان جنگ سے ان کی اعانت کی۔ سہیل بن عمرو نے مشرکین کی ایک جماعت کو اپنے مال و اسباب سے تقویت پہنچائی۔ سعد بن اسود نے بھی ایسا ہی کیا، ابوسفیان کے دونوں بیٹے حنظلہ و عمرو نے جنگ کی تحریک دلائی اور کہا کہ مال کے مالک ابوسفیان ہیں۔ اسی طرح جوش دلانے والوں میں طعیمہ بن عدی تھے، حویطب بن عبدالعزی نے قریش کو سو اور بعض کے بیان کے مطابق دوسو دینار دیے، جس سے ہتھیار اور دوسرے آلات جنگ خریدے گئے۔ قریش کا

کوئی شخص نہ تھا جو اس جنگ میں نہ نکلا ہو اگر کسی سبب سے کوئی رکا رہ گیا تو اس نے اپنی جگہ کسی کو بھیجا۔ **ولم یتخلف احد من قریش لعلة الا وجه مکانه رجلا** (ص ۲۹۲) چنانچہ ابولہب مرض کے سبب شریک نہیں ہوا تو اس نے عاص بن ہشام بن مغیرہ کو اس شرط پر بھیجا کہ اس میں جو مال حاصل ہوگا وہ اس سے بری رہے گا۔

آنحضورؐ کا کفار قریش کو لوٹ جانے کا مشورہ: بلاذری کے بیان کے مطابق آپؐ نے حضرت عمرؓ کے ذریعہ قریش کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ وہ واپس لوٹ جائیں مگر انہوں نے انکار کیا (۲۹۲) **بعث رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عمر بن الخطاب الی قریش یامرها بالانصراف فابوا**۔ یہ روایت بالعموم اور کتابوں میں نہیں ملتی۔ اسی طرح اگلی روایت ہے کہ آپؐ بدر کے قریب پہنچے تو چونکہ رمضان کا مہینہ تھا، آپؐ نے اعلان کرایا کہ "**افطروا یا معشر العصاة**" مگر آپؐ کے اعلان پر انہوں نے افطار نہیں کیا یعنی روزہ نہیں توڑا، آپؐ نے روزہ توڑ دیا۔ یہ روایت بھی عام کتب سیر میں نہیں ملتی۔ بلاذری نے راویوں کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ آپؐ نے انصار سے مشورہ طلب کیا تو حباب ابن منذر بن جموح نے مشورہ دیا کہ ایسی جگہ فروکش ہوں جہاں پانی قریب ہو، جبریلؑ نے اس رائے کو پسند کیا، اس وقت سے آپؐ ان کو "ذاالرائی" کے لقب سے بلاتے تھے۔ آپؐ کے لیے کھجور کی ٹہنیوں کی جھونپڑی بنائی گئی۔ آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ اس میں داخل ہوگئے اور دونوں اس میں باہم مشورہ کرتے تھے۔ (ص ۲۹۳)

نشان شناخت: بدر کے روز آپؐ کا شعار (نشان شناخت) "امت امت"، مہاجرین کا "بنی عبدالرحمٰن"، خزرج کا "بنی عبداللہ"، اوس کا "بنی عبداللہ" تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی مدد ملائکہ اور تیز ہوا کے ذریعہ کی، آپؐ نے فرمایا میری مدد "بادصبا" کے ذریعہ ہوئی اور عاد کو پچھوا ہوا کے ذریعہ ہلاک کیا گیا۔ (ایضاً) آپؐ نے مٹھی بھر کنکری لی، میدان کی طرف پھینکا، چہرے بدشکل ہوگئے اور قریش کو شکست ہوئی۔

اسلامی علم: بدر کے روز رسول اللہؐ کا جھنڈا مصعب بن عمیر، اوس کا سعد بن معاذ، خزرج کا حباب بن منذر کے ساتھ تھا (ایضاً)۔ مشرکین کے بھی تین جھنڈے تھے۔ ایک نضر بن حارث، دوسرا طلحہ بن ابی طلحہ اور تیسرا ابی عزیز بن عمیر کے ساتھ تھا (ایضاً)۔ حیسان بن ایاس خزاعی نے اہل مکہ

اورزید بن حارثہ مولی رسول اللہؐ نے اہل مدینہ کو جنگ بدر کی اطلاع دی۔(۲۹۴)

(باقی)

مراجع وحواشی

(۱) بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ توبہ باب قولہ ولاتصل علی احد، جلد ۲، ص ۶۷۴۔ (۲) ایضاً، حاشیہ بخاری ۶۷۴۔ (۳) سیرۃ النبی، جلد ۱، ص ۲۹۶۔ (۴) سیرت ابن ہشام، جلد ۲، ص ۳۴۱۔ (۵) ایضاً۔ (۶) الزرقانی علی المواہب اللدنیہ، محمد بن عبدالباقی زرقانی، جلد ۱، ص ۴۴۸، مکتبہ میسریہ مصر، ۱۸۷۰ء، بحوالہ نسائی۔ (۷) تفسیر ابن جریر، محمد بن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ، جلد ۲، ص ۱۰۶، مطبعہ میمینہ مصر۔ (۸) غزوات کی یہی تعداد موسیٰ ابن عقبہ، واقدی، ابن سعد، ابن جوزی، دمیاطی اور عراقی وغیرہ متعدد اہل مغازی سے منقول ہے، جب کہ سرایا کی تعداد میں اختلاف ہے، ابن اسحاق نے ۳۸، واقدی اور ابن سعد نے ۴۸ اور ابن جوزی نے ۵۶، ابن عبدالبر نے ۳۵ بتائی ہے، دیکھیے غزوات نبویؐ کی اقتصادی جہات، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، ص ۱۲، ادارہ مطالعات اسلامی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۹۹ء۔ (۹) ایضاً۔ (۱۰) مولانا شبلی نے یہ فاصلہ مدینہ سے تقریباً ۸ منزل (۸۰ میل) لکھا ہے، دیکھیے سیرۃ النبی، جلد ۱، ص ۲۲۲۔ (۱۱) معاہدہ کے مزید الفاظ روض الانف، جلد ۲، ص ۵۸، اور زرقانی، جلد ۱، ص ۴۵۹ پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ (۱۲) بخاری، جلد ۲، ص ۵۶۳۔ (۱۳) دیکھیے اصح السیر، ابوالبرکات عبدالروف دانا پوری، ص ۸۲ و سیرۃ النبی، جلد ۱، ص ۲۲۳۔ (۱۴) سیرۃ النبی، جلد ۱، ص ۲۲۳۔ (۱۵) ایضاً، ص ۲۲۶۔ (۱۶) طبری، جلد ۳، ص ۱۲۷۵۔ (۱۷) ایضاً، ص ۱۲۸۴۔ (۱۸) بخاری، جلد ۲، ص ۵۶۴۔

ضروری تصحیح

معارف مارچ ۲۰۱۸ء میں انساب الاشراف کی دوسری قسط میں درج ذیل غلطیوں کی تصحیح کرلی جائے:

ص ۱۶۸، سطر ۳، قدیرتقی قدیرتقی (صحیح)

ص ۱۷۸، سطر ۱۸، قسمت متعجبا قمت متعجبا (صحیح)

شعر العجم

ایک اہم ادبی وتنقیدی کارنامہ

جناب الطاف احمد اعظمی

(۳)

سادگیِ ادا: اس سے مراد یہ ہے کہ کلام کے اجزائے ترکیبی اپنی اصلی حالت پر ہوں اور اس میں کوئی ایسی لفظی اور معنوی پیچیدگی نہ ہو جس سے اس کی تفہیم مشکل ہو جائے اور اہل علم کا متوسط طبقہ تو کجا خواص کا طبقہ بھی اس کے فہم سے قاصر ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ کلام میں نامانوس الفاظ وتراکیب، عسیر الفہم تشبیہات واستعارات، غیر معروف تلمیحات اور مشکل علمی اصطلاحات سے گریز کیا جائے کہ اس سے کلام میں معنوی اغلاق پیدا ہوتا ہے۔

سادگی میں روزمرہ کے اہتمام کی جو اہمیت ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''سادگی ادا میں اس بات کو بہت دخل ہے کہ روزمرہ اور بول چال کا زیادہ لحاظ رکھا جائے اور روزمرہ چونکہ عام زبانوں پر چڑھا ہوتا ہے، اس لیے ایک لفظ ادا ہونے کے ساتھ پورا جملہ ذہن میں آ جاتا ہے اور اس کے سہارے سے مشکل مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے نامور شعراء کا اصلی کمال یہی ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ خیال روزمرہ اور بول چال میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ گویا معمولی بات ہے۔ یہاں شاید کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ سادگی کوئی عام چیز نہیں قرار پا سکتی۔ عوام کے لیے معمولی خیالات بھی عسیر الفہم ہیں اور خواص مشکل مضامین کو بھی آسانی سے سمجھ سکتے

آر زیڈ۔۹۰۱ بی، فلیٹ نمبر ۴۰۲، گلی نمبر ۲۴، تغلق آباد ایکسٹینشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹۔

ہیں۔لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔سادگی یہی ہے کہ عام وخاص دونوں بے تکلف سمجھیں۔
فرق جو ہوگا وہ یہ ہوگا کہ عام آدمی شعر کا ظاہری اور سرسری مطلب سمجھ لیں گے لیکن
خواص کی نظر اس کے نکات، لطائف اور دقائق تک پہنچے گی اور ان پر شعر کا اثر عوام
سے زیادہ ہوگا، مثلاً یہ شعر:

مادر پیالہ عکس رخِ یار دیدہ ایم اے بے خبر لذت شرب مدام ما

اس کا مطلب ہر خاص و عام سمجھ سکتا ہے البتہ اس میں تصوف کا جو مسئلہ
بیان کیا گیا ہے وہ خاص ارباب حال کے سمجھنے کی چیز ہے"۔(۷۷)

مولانا شبلی کا یہ خیال ادنی اور متوسط درجہ کی شاعری پر تو منطبق ہوتا ہے لیکن اعلیٰ درجہ کی
شاعری پر اس کا اطلاق نہ ہوگا۔اس قسم کی شاعری کا تعلق عوام کے بجائے خواص سے ہوتا ہے اور اس
میں معنوی تہہ داری کی وجہ سے ابہام کا ہونا مستبعد نہیں ہے۔وہ ابہام بلاشبہہ عیب میں داخل ہے جو
معنی کے عدم ترسیل یا نامانوس تراکیب کے انتخاب یا الفاظ کو شاذ معنی میں استعمال کرنے سے پیدا ہوتا
ہے۔غالب کی ابتدائی غزلوں میں اسی قسم کا ابہام پایا جاتا ہے۔اسی طرح وہ معنوی ابہام بھی ناپسندیدہ
ہے اور شعری عیب کے زمرے میں داخل ہے، جو بالارادہ کلام میں پیدا کیا جائے کہ وہ بسا اوقات
ابہام سے گزر کر ایہام کی حد میں داخل ہوجاتا ہے۔شاعری بہرحال چیستاں گوئی کا نام نہیں ہے۔میر
کے یہاں بھی معنوی ابہام پایا جاتا ہے لیکن اس کا تعلق زیادہ تر طرز ادا کی جدت سے ہے۔مثلاً ان کا
مشہور شعر ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

جدت ادا: شعر ہو یا نثر دونوں کی خوبی کا تعلق طرز بیان کی ندرت اور تنوع سے ہے۔اعلیٰ
اور ادنیٰ شعراء کے کلام میں جو چیز فرق و امتیاز پیدا کرتی ہے وہ اظہار بیان کی جدت ہی ہے۔مولانا شبلی
نے لکھا ہے کہ:"شاعری میں سب سے مقدم چیز جدت ادا ہے بلکہ بعض اہل فن کے نزدیک جدت ادا
ہی کا نام شاعری ہے۔ایک بات سیدھی طرح کہی جائے تو ایک معمولی بات ہے اسی کو اگر جدید انداز
اور نئے اسلوب سے ادا کردیا جائے تو یہ شاعری ہے"۔(۷۸)

لیکن اس مقام پر مولانا شبلی نے جدت ادا کی جو مثالیں دی ہیں، ان سے اس کا مفہوم بخوبی واضح نہیں ہوسکا ہے، البتہ ''شعرالعجم'' جلد اول میں خیام کی رباعیات پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے جدت ادا کے مفہوم کو زیادہ بہتر طور پر پیش کیا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''شاعری کی بڑی ضروری شرط اسلوب بیان کی جدت ہے۔ شاعر ایک معمولی بات کو لیتا ہے اور ایسے دلکش اور ندرت آمیز اسلوب سے ادا کرتا ہے کہ سب وجد کرنے لگتے ہیں۔ اسلوب بیان کی دل آویزی کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ کبھی صرف زبان کی بے تکلفی، روانی اور شگفتگی یہ کام دیتی ہے، کبھی عام طبقۂ ادا کے بدل دینے سے یہ بات پیدا ہوتی ہے، کبھی شاعرانہ طرز استدلال سے، کبھی شوخی وظرافت سے، کبھی استعارہ وتشبیہ کی ندرت سے، اور سچ یہ ہے کہ اس کی تمام ادائیں متعین اور مشخص نہیں ہوسکتیں۔ سننے والے کو اتنا محسوس ہوتا ہے کہ کسی چیز نے دل میں چٹکی لے لی، کس نے لی، کیوں لی؟ یہ کچھ نہیں معلوم۔ خیام کی رباعیاں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں ہیں لیکن سب کا قدر مشترک صرف چند مضامین ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلہ جبر وقدر، توبہ واستغفار، ان میں سے ایک ایک مضمون کو وہ سو سو دفعہ کہتا ہے لیکن ہر دفعہ اس طرح بدل کر کہتا ہے کہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور اس سے عبرت کا مضمون نہایت پامال مضمون ہے لیکن خیال ہر بار ایک ایسا نیا اسلوب ڈھونڈھ لاتا ہے کہ نیا اثر پیدا ہوتا ہے۔ توبہ واستغفار بھی ایک فرسودہ مضمون ہے لیکن جس طرح خیام اس کو ادا کرتا ہے سننے والے کی آنکھ سے آنسو نکل پڑتے ہیں''۔ (۷۹)

جدت ادا سے شعر کے حسن میں جو اضافہ ہوتا ہے اس کو دکھانے کے لیے مولانا شبلی نے خیام کی چار رباعیاں نقل کی ہیں، جن میں ایک ہی مضمون یعنی توبہ واستغفار الگ الگ پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ یہ رباعیاں ملاحظہ ہوں: (۸۰)

بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن بر جان و دلِ اسیرِ من رحمت کن
بر پائے خرابات رو من بخشائے بر دست پیالہ گیرِ من رحمت کن

در ملک تو از طاعت ما ہیچ فزود؟　　وز معصیتے کہ ہست نقصانے بود
بہ گزار و مگیر زاں کہ معلومم شد　　گیرندۂ دیری و گزارندۂ زود

من بندۂ عاصیم، رضائے تو کجا است　　تاریک دلم، نور صفائی تو کجا است
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی　　آں بیع بود، لطف وعطائی تو کجا است

آنم کہ پدید گشتم از قدرت تو　　صد سالہ شدم بہ ناز و نعمت تو
صد سال بہ امتحان گنہ خواہم کرد　　تا جرمِ من است بیش یا رحمت تو

ان رباعیوں کو نقل کرنے کے بعد مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"خیام کی طرح حافظ کے یہاں بھی اسلوب بیان کی جدت طرازی ملتی ہے۔ وہ اس بات پر قادر تھے کہ ایک ہی مضمون کو جملہ فنی لوازم کے ساتھ مختلف پیراؤں میں ادا کرسکیں یا کسی پامال مضمون کو جدت ادا سے دلفریب بنادیں، مثلاً معشوق کی زلف کو بنفشہ پر ترجیح دی جاتی ہے اور یہ ایک معمولی مضمون تھا۔ لیکن حافظ نے محض اپنی جدت ادا سے اس عام سے مضمون کو بہت بلند کردیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

بنفشہ طرّۂ مفتولِ خود گرہ می زد
صبا حکایتِ زلفِ تو درمیان انداخت" (۸۱)

جدت ادا کی مثالیں شیخ سعدی کے کلام میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً تواضع اور انکسار ایک عام مضمون ہے لیکن سعدی نے اس پیش پا افتادہ مضمون کو حسن بیان سے چار چاند لگادیے ہیں۔ فرماتے ہیں:

گلے خوشبوے در حمام روزے　　فتاد از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری　　کہ از بویِ دل آویزِ تو مستم
بگتفا، من گلِ ناچیز بودم　　و لیکن مدتے باگل نشستم
جمالِ ہم نشین در من اثر کرد　　وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اسی طرح توبہ واستغفار اور تضرّع وزاری ایک عام نفسی حالت ہے اور کثیر الوقوع ہے۔ اس عامۃ الورود نفسی حالت کو سعدی نے درج ذیل حکایت کے پیرایہ میں جس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے اس

کواہل نظر بخوبی سمجھ سکتے ہیں:

شنیدم کہ مستی ز تاب نبید به مقصورۂ عابدے بردوید
بنالید بر آستانِ کرم کہ یارب بہ فردوسِ اعلیٰ برم
مؤذن گریباں گرفتش کہ ہین سگ ومسجد، اے فارغ از عقل ودین
چہ شائستہ کردی کہ خواہی بہشت نمی زیبدت ناز بر روی زشت
بگفت ایں سخن پیر وبگریست مست کہ مستم بدار از من اے خواجہ دست
عجب داری از لطفِ پروردگار کہ باشد گنہگارے امیدوار
ترا می نگویم کہ عذرم پزیر درِ توبہ باز است وحق دست گیر
ہمی شرم دارم ز لطفِ کریم کہ خواہم گنہ پیشِ عفوش عظیم

''ایک مست نشہ کہ زور میں مسجد میں گھس گیا اور رو کر پکارا کہ اے خدا! مجھ کو بہشت میں لے جانا۔ مؤذن نے اس کا گریباں پکڑ کر کہا: او سگِ نجس! مسجد میں تیرا کیا کام، تو نے کون سا اچھا عمل کیا ہے کہ بہشت کا دعویٰ ہے۔ مست رو پڑا اور بولا کہ کیا آپ کو خدا کے لطف عمیم سے یہ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک گنہگار اس کی مغفرت کا امیدوار ہو، میں نے آپ سے تو مغفرت کی خواہش نہیں کی۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور خدا دست گیر ہے۔ مجھ کو تو شرم آتی ہے کہ میں خدا کے عفو کے مقابلہ میں اپنے گناہ کو زیادہ سمجھوں''۔ (۸۲)

اس سلسلے میں راقم الحروف ایک دو مثالیں اردو شاعری سے بھی پیش کرتا ہے۔ میر کا مشہور قطعہ ہے ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

اس قطعہ میں جو مضمون نظم کیا گیا ہے وہ ایک عام خیال ہے یعنی اصحاب جاہ وثروت کے انجام سے عبرت پذیری لیکن حسن بیان یعنی تمثیلی اسلوب نے اس کو نہایت پُراثر بنا دیا ہے۔ میر ہی کی ایک غزل کا شعر ہے ؎

کہا اس نے گل کو ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

شاعر نے دنیا کی بے ثباتی کو، جو ایک پامال مضمون ہے، اچھوتے اسلوب میں ادا کیا ہے اور حسن معنی کی انتہائی بلندی کو چھولیا ہے۔ میر کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو جو جدت ادا کی بہترین مثال ہے ؎

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

فصاحت و بلاغت: محاسن شعر کے بارے میں اوپر جو باتیں کہی گئی ہیں ان کو اگر اجمالاً کہنا چاہیں تو صرف فصاحت و بلاغت کے الفاظ سے تعبیر کرسکتے ہیں، یعنی اگر کسی شاعر کا کلام فصیح و بلیغ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں شعر کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ مولانا شبلی نے ''شعر العجم'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' دونوں میں ایک سے زیادہ مقامات پر فصاحت و بلاغت سے بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ فلاں کا کلام فصیح و بلیغ ہے اور فلاں کا فصیح و بلیغ نہیں ہے۔

مولانا شبلی نے فصاحت کی وضاحت میں الفاظ کے صوتی پہلو کو زیادہ اہمیت دی ہے اور لکھا ہے کہ:

''لفظ در حقیقت ایک قسم کی آواز ہے اور چونکہ آوازیں بعض شیریں، دلآویز اور لطیف ہوتی ہیں، مثلاً طوطی و بلبل کی آواز اور بعض مکروہ و ناگوار، مثلاً کوّے اور گدھے کی آواز۔ اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، بعض شستہ، سبک، شیریں اور بعض ثقیل، بھدّے، ناگوار۔ پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں اور دوسرے کو غیر فصیح۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ فی نفسہٖ ثقیل اور مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں ان کا استعمال نہیں ہوا ہے یا بہت کم ہوا ہے۔ اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداءً استعمال کیے جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ اس کو فن بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز خیال کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ نکتہ یہاں لحاظ کے قابل ہے کہ بعض موقعوں پر غریب لفظ کی غرابت اس وجہ سے کم ہوجاتی ہے کہ اس کے ساتھ کے الفاظ بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے:

ذریتِ رسول کی خاطر جلائی نار

نار کا لفظ اس موقع پر نہایت نامانوس اور بے گانہ ہے لیکن یہی لفظ جب فارسی ترکیبوں

کے ساتھ اردو میں مستعمل ہوتا ہے مثلاً نارِ دوزخ، نارِ جہنم تو وہ غرابت نہیں رہتی۔

فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے یعنی بعض الفاظ فصیح ہیں، بعض فصیح تر، بعض اس سے بھی بڑھ کر فصیح، مثال کے طور پر ہم دو چار مثالیں نقل کرتے ہیں جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلاف مراتب کا اندازہ ہوسکے گا۔ ان مثالوں میں ایک ہی مضمون مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

ے کس نے دی انگوٹھی رکوع و سجود میں
ے سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں
ے آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو
ے آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو
ے رویا میں بھی حسین کو رویا ہی کرتے ہیں
ے حسرت ہے یہ کہ خواب میں بھی رویا کیجیے
ے جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحبِ مکاں
ے جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے" (۸۳)

یہ صحیح ہے کہ بعض الفاظ نرم، شیریں اور لطیف ہوتے ہیں اور جب زبان سے ادا ہوتے ہیں تو کانوں کو خوش گوار معلوم ہوتے ہیں اور قوت سامعہ ان سے لطف اندوز ہوتی ہے اور بعض الفاظ کرخت، ثقیل اور بھدے ہوتے ہیں اور ان سے قوت سامعہ کو کوئی حظ حاصل نہیں ہوتا بلکہ سخت ناگوار ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اول الذکر فصیح ہیں اور موخر الذکر غیر فصیح۔ الفاظ کے فصیح اور غیر فصیح ہونے کا معیار دو چیزیں ہیں، ایک مواقع استعمال اور دوسرے معنی۔ ممکن ہے کہ ایک لفظ بجائے خود فصیح ہو لیکن موقع و محل کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے غیر فصیح بن جائے۔

علامہ شبلی نے فصاحت کے اس پہلو پر جس گیرائی اور گہرائی سے تفصیلی بحث کی ہے وہ بڑی فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے۔ لکھتے ہیں:

"کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ قرآن مجید میں ہے "ما کذب الفواد ما رأی"۔ فواد اور

قلب دو ہم معنی لفظ ہیں اور دونوں فصیح ہیں لیکن اگر اس آیت میں فواد کے بجائے قلب کا لفظ آئے تو خود یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا، جس کی وجہ یہ ہے کہ گو قلب کا لفظ بجائے خود فصیح ہے لیکن ماقبل و مابعد کے جو الفاظ ہیں، ان کی آواز کا تناسب قلب کے لفظ کے ساتھ نہیں ہے۔

میر انیس کا مصرع ہے: فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور۔ صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں اور دونوں فصیح ہیں، انیس نے مختلف موقعوں پر ان دونوں کا استعمال کیا ہے اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے لیکن اگر اس مصرع میں صحرا کے بجائے جنگل کا لفظ آجائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ ذیل کے شعر میں:

طائر ہوا میں مست ، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

اگر جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرع پھس پھسا ہو جاتا ہے۔ شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجہ کے فصیح ہیں لیکن اس شعر میں:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی۔ یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر قدرے فصیح ہے، اس مصرع میں:

شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

شبنم کے بجائے لایا جائے تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔ الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کے صوت اور سر ہیں، اس لیے ان کی لطافت، شیرینی اور روانی اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک گرد و پیش کے الفاظ بھی لَے میں ان کے مناسب ہوں۔

دبیر کا مشہور مصرع ہے: زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے۔ اس میں جتنے الفاظ ہیں یعنی زیر، قدم، والدہ، فردوس بریں سب بجائے خود فصیح ہیں لیکن ان کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرع پیدا ہوا وہ اس قدر بھدّا اور گراں ہے کہ زبان اس کا تحمل نہیں کرسکتی۔ شاید تم کو خیال ہو کہ مصرع کی ترکیب چونکہ فارسی ہو گئی ہے، اس لیے ثقل پیدا ہو گیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ سینکڑوں شعروں میں اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا۔ مثلاً میر انیس کہتے ہیں ؎

میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں
میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمد کا مکیں

پہلے مصرع میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالی اضافت بھی موجود ہے لیکن یہ بھدّا پن اور ثقل نہیں ہے۔ الفاظ کے توازن وتناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہوجاتا ہے وہ ایک خاص مثال میں آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ میر انیس حضرت علی اکبر کی اذان دینے کی تعریف ایک موقع پر اس طرح کرتے ہیں:

تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

اسی مضمون کو دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

وہی مضمون ہے، وہی الفاظ ہیں لیکن ترکیب کی ساخت نے دونوں مصرعوں میں کس قدر فرق پیدا کردیا ہے"۔(۸۴)

معانی و الفاظ کی مناسبت بھی فصاحت میں داخل ہے، یعنی جس طرح کا مضمون ہو اسی کی مناسبت سے الفاظ بھی لائے جائیں۔ مثلاً درد و غمگینی کا مضمون ہے تو وہی الفاظ لائے جائیں جن سے درد و غم جھلکتا ہو، لطف و شادمانی کا مضمون ہے تو نرم، شیریں اور لطیف الفاظ استعمال کیے جائیں، رزم یعنی فخر و غرور کا مضمون ہے تو پُرزور اور پُرشوکت الفاظ لائے جائیں۔

مولانا شبلی نے فصاحت کے اس پہلو پر بھی نہایت عمدہ بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ: "رزم، بزم، حسرت، شوق، ہر ایک مضمون کے لیے خاص خاص قسم کے الفاظ موزوں ہیں اور ان مضامین کے لیے انہی الفاظ کو استعمال کرنا چاہیے۔ مثلاً ایک شاعر نے جلال و غیظ کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

؎ کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

؎ کیا جائے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

؎ لرزہ تھا رعبِ حق سے ہر اک نابکار کو
روکے تھا ایک شیرِ جری دس ہزار کو" (۸۵)

جس طرح فصاحت کا تعلق الفاظ اور ان کی ترکیب اور ان کے محلِ استعمال سے ہے اسی طرح بلاغت کا تعلق معنی اور اس کے نظم و ترتیب سے ہے۔لیکن بلاغت میں فصاحت بھی داخل ہے یعنی اگر کوئی کلام بلیغ ہے تو وہ لازماً فصیح بھی ہوگا۔اسی لیے علمائے ادب کے نزدیک بلاغت کی پہلی شرط کلام کا فصیح ہونا ہے لیکن فصاحت کے ساتھ بلاغت لازمی شرط نہیں ہے۔عین ممکن ہے کہ کلام فصیح ہو لیکن بلیغ نہ ہو۔

بلاغت کی تعریف مولانا شبلی کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ:

> ''کلام اقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح ہو۔مقتضائے حال کے موافق ہونا ایسا جامع لفظ ہے جس میں بلاغت کے تمام انواع و اسالیب آجاتے ہیں''۔(۸۶)

مولانا شبلی نے مقتضائے حال کی تشریح میں لکھا ہے کہ:

> ''جو واقعہ فرض کیا جائے وہ ایسا ہو کہ وقت اور حالت کے لحاظ سے اس کا واقع ہونا یقینی ہونے کے برابر ہو،اس کے ساتھ واقعہ کے جزئیات اور کیفیات جو بیان کیے جائیں وہ بالکل مقتضائے حال کے موافق ہوں اور اس طرح بیان کیے جائیں کہ واقعہ کی صورت آنکھوں میں پھر جائے''۔(۸۷)

مولانا شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''ہر واقعہ اور مضمون کے ادا کرنے کے لیے بلاغت کے خاص خاص طریقے ہیں،مثلاً سفر کی تیاری کے بیان میں بلاغت کا یہ اقتضاء ہے کہ سفر کے وقت جو جو واقعات پیش آتے ہیں،ان کی تصویر کھینچی جائے،سفر کی آمادگی،سواریوں کی تقسیم، زادسفر کا انتظام،محملوں اور کجاووں کی تیاری،مستورات کے پردہ کا انتظام،دوست اور احباب کے وداعی جذبات، بھائی، بہنوں اور عزیزوں کی گریہ وزاری،دل دہی اور صبر کے کلمات،یہ تمام باتیں تفصیل سے بیان کی جائیں اور اس طرح کی جائیں کہ آنکھوں کے سامنے بعینہٖ سفر کا نقشہ پھر جائے۔میر انیس نے جہاں جہاں سفر کا بیان کیا،ان نکتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔
>
> دو حریفوں کی باہمی معرکہ آرائی کو اس طرح بیان کیا جائے کہ پہلے دونوں

کے سراپا، ڈیل ڈول اور اسلحۂ جنگ سجنے کا نقشہ دکھایا جائے، پھر بتلایا جائے کہ دونوں نے فن جنگ کے کیا کیا ہنر دکھائے، حریف نے حریف پر کیوں کر حملہ کیا، کس طرح وار بچایا، تلوار کے کیا کیا ہاتھ دکھائے، بندکیوں کر باندھے وغیرہ وغیرہ۔ غرض ہر واقعہ اور معاملہ کے بیان کرنے میں بلاغت کا یہ اقتضاء ہے کہ اس کی تمام خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ دلوں پر وہی اثر طاری ہو جو خود واقعہ کے پیش آنے سے پڑتا ہے''۔(۸۸)

معلوم ہوا کہ مولانا شبلی کے نزدیک بلاغت کے دو پہلو ہیں، ایک کلام کا فصیح ہونا اور دوسرے اس کا مقتضائے حال کے موافق ہونا۔ اس کو ہم بلاغت کی جامع تعریف کہہ سکتے ہیں لیکن بلاغت درجۂ کمال تک اس وقت پہنچتی ہے، جب اس میں مذکورہ دو اوصاف کے ساتھ حسن معنی کی خوبی بھی شامل ہو۔ خود لفظ بلاغت اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

لغت میں بلیغ کے معنی پہنچنے والے کے ہیں اور جو چیز دل میں پہنچتی ہے، وہ دراصل معانی ہیں نہ کہ الفاظ۔ علامہ حمید الدین فراہی (م ۱۹۳۰ء) نے، جو عربی ادب اور قرآن فہمی میں منفرد مقام رکھتے تھے، بلاغت کی نہایت عمدہ تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''جب کوئی مضمون فی نفسہ بیہودہ اور لغو ہوتا ہے تو وہ کیسے ہی فصیح اور شستہ الفاظ میں ادا کیا جائے، دل میں جگہ نہیں کرتا بلکہ اچٹ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس قسم کے مضمون سے کسی احمق اور بدمذاق کو مزہ آئے لیکن کلام کے حسن و خوبی کا فیصلہ احمقوں کے مذاق کی رو سے نہیں ہوسکتا، غرض ان اسباب سے کلام میں جب تک مضمون اور معنی کی خوبی نہ ہو دل میں نہیں اتر سکتا اور اس بنا پر اس کو بلیغ بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے عرب کلام کی تعریف حسن مضمون کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں بلیغ کا لفظ آیا ہے اسی معنی میں آیا ہے، مثلاً ''**قل لھم فی انفسھم قولا بلیغا**''، یعنی اے محمد! ان لوگوں سے ایسی بات کہو، جو بلیغ ہو یعنی ان کے دل میں اتر جائے، اسی طرح آیت ''**وللہ الحجۃ البالغۃ**'' سے بھی یہی مراد ہیں۔ حاصل یہ کہ جو مضمون جس قدر زیادہ دل نشیں اور دل پذیر ہوگا اسی قدر زیادہ بلیغ ہوگا۔

ایک اور واضح مثال سے یہ نکتہ ذہن نشیں ہوسکتا ہے۔فرض کرو ایک شخص کسی آدمی کو گالیاں دے رہا ہے اور گالیوں میں ہر قسم کی سخن آرائی،لفاظی،جدت پسندی، استعارہ بندی صرف کرتا ہے،الفاظ بھی نہایت شستہ،بامحاورہ اور فصیح ہیں تو کیا تم اس شخص کو فصیح و بلیغ کہو گے؟

ان مقدمات سے معلوم ہوگا کہ بلاغت جس چیز کا نام ہے وہ عقل کی دست و بازو،انسانیت کا عنصر،راستی کی مترجم اور فخر کا تاج ہے۔وہ اس رتبہ کی چیز ہے کہ ایک پیغمبر اولوا العزم کا معجزہ قرار پائے۔اسی کا اثر تھا کہ قرآن مجید کے اعجاز نے اعجازِ موسوی کو بے حقیقت کردیا،عصائے موسوی کا معجزہ یہودیوں یا قبطیوں کو غلامی کی حد سے آگے نہ بڑھا سکا لیکن اعجاز قرآنی نے لوگوں کو حضیض خاک سے اٹھا کر آسمان تک پہنچادیا لیکن اگر بلاغت کی وہ حقیقت ہو جو ارسطو نے بیان کی تو نعوذ باللہ وہ کسی پیغمبر کا معجزہ کیا قرار پاسکتی ہے"۔(۸۹)

حقیقت بلاغت کی اس سے بہتر تشریح ممکن نہیں ہے۔یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ تشبیہات، استعارات،حذف،ایجاز،طرز ادا وغیرہ سب بلاغت کے دست و بازو ہیں،ان سے کلام کے حسن و جمال میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے لیکن بجائے خود ان کا نام بلاغت نہیں ہے جیسا کہ بہت سے علمائے معانی نے خیال کیا ہے۔بلاغت کی روح اثر انگیزی ہے اور یہ چیز سچائی،جذبے کی حرارت اور علوئے خیال کے تابع ہے۔

بلاغت کے لیے ضروری ہے کہ الفاظ کم سے کم استعمال ہوں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب صاحب کلام زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہو۔قرآن مجید کی بلاغت یعنی اس کی اثر انگیزی کا یہی راز ہے۔کفار مکہ اس کی غیر معمولی تاثیر کی وجہ سے اس کو جادو کہتے تھے۔شاعری میں بھی جادو ہے اور یہ کلام میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب الفاظ سبک اور شیریں ہوں اور ان کی ترکیب میں غیر معمولی موزونیت ہو،حشو و زوائد بالکل نہ ہوں،پیرایۂ بیان عمدہ اور حسب معنی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں شاعر کا سوزِ دروں شامل ہو۔

شاعری کی غرض و غایت: ارسطو نے شاعری کا مقصد لطف اور تفریح طبع قرار دیا ہے۔چونکہ

اس کے نزدیک شاعری دراصل محاکات ہے اور انسان کی فطرت میں محاکات کا مادہ موجود ہے، اس لیے اس کو اس چیز سے ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ علامہ حمید الدین فراہی نے لکھا ہے کہ:

"یونان میں شاعری سے جو کام لیا جاتا تھا وہ صرف مذاقیہ جلسوں کا گرم کرنا ہوتا تھا۔ شعراء عموماً مذاقیہ اور مصنوعی قصے نظم کرتے تھے، یہاں تک کہ شاعر سخن ساز اور دروغ باز کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اس بنا پر ارسطو نے یہ اصول قائم کیا کہ شاعری کا اصلی مقصد لطف اندوزی ہے اور اسی بنا پر اس کی رائے ہے کہ اگر راست گوئی سے یہ مقصد حاصل نہ ہو تو شاعر کے لیے واقعہ کا گھٹا بڑھا دینا جائز ہے"۔(۹۰)

ارسطو کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شاعری رزم بھی ہے اور بزم بھی ہے، اور اس کا فیصلہ ہر قوم کا تمدن کرتا ہے۔ سادہ اور فطری تمدن میں شاعری زندگی اور قوت کی علامت ہوتی ہے جیسا کہ عربوں کی قدیم شاعری سے واضح ہے۔ لیکن جب تمدن ترقی کر جاتا ہے اور عیش وعشرت کے سامان کی خوب فراوانی ہو جاتی ہے تو قوم کے اندر سے رفتہ رفتہ رزم آرائی کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور شاعری بزم کی زینت بن جاتی ہے جیسا کہ فارسی شاعری کے دور متوسط میں پیش آیا اور جس وقت تمدن انحطاط کے دور میں داخل ہوتا ہے تو شاعری سے انجمن آرائی کا عنصر بھی نکل جاتا ہے اور اس میں یاس وافسردگی، عشق و محبت میں بے راہ روی اور دنیا سے گریز کے رجحانات غالب آجاتے ہیں۔ قدیم اردو شاعری اس کی ایک عمدہ مثال ہے جو مسلم تمدن کے دور زوال میں پلی بڑھی ہے۔ فارسی شاعری کے ساتھ یہی معاملہ اس کے دور آخر میں پیش آچکا تھا، جس کے باقیات سیّئہ اردو شاعری کو بطور ورثہ ملے۔ اس قسم کی شاعری، خواہ اس کا ادبی وفنی مرتبہ کتنا ہی بلند ہو، قومی زندگی کے لیے زہر ہلاہل ہے۔

مولانا شبلی اس شاعری کے قائل تھے جس میں زندگی اور توانائی ہو۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

"شعر ایک قوت ہے جس سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طور سے کیا جائے۔ عرب میں شاعری کی ابتدا رجز سے ہوئی یعنی میدان جنگ میں جب دو حریف مقابلہ کے لیے بڑھتے تھے تو جوش میں فخریہ موزوں فقرے ان کی زبان سے نکلتے تھے۔ یہ دو چار شعر سے زیادہ نہیں ہوتے تھے لیکن طبل جنگ کا کام دیتے تھے۔ عمرو بن ہند، بادشاہ عرب سے قبیلہ تغلب کی لڑائی

عرب کا ایک مشہور واقعہ ہے۔عمرو بن کلثوم نے لڑائی کے تمام واقعات کو ایک قصیدہ میں نظم کیا ہے۔اس نے اس قصیدہ میں تمام واقعات اور اپنی حمیت وغیرت کو اس جوش سے لکھا ہے کہ دوسو برس تک قبیلہ تغلب کا ہر بچہ اس کے اشعار بچپن ہی سے سیکھتا اور یاد کرتا تھا۔اہل تاریخ کا بیان ہے کہ اس قصیدہ کی بدولت کئی سو برس تک اس قبیلہ میں شجاعت اور دلیری کے اوصاف قائم رہے۔آج بھی یہ اشعار افسردہ دلوں کو گرما دیتے ہیں''۔(۹۱)

لیکن فارسی شاعری میں عربی کا مذکورہ وصف موجود نہیں ہے اور اس کی وجہ ان کا مخصوص تمدن تھا۔مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ''اکثر شعرائے ایران نے شاعری کا صحیح استعمال نہیں کیا ہے بلحاظ غالب، شاعری صرف دو کام کے لیے مخصوص ہوگئی،سلاطین اور امراء کی مداحی،جس میں کذب وافترا کا طومار باندھا جاتا تھا،اور عشق وعاشقی جو دوراز کار مبالغوں اور فضول گوئیوں سے معمور تھی''۔(۹۲)

گذشتہ صفحات میں''شعرالعجم''کے اہم مباحث کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس سے اس کا ادبی اور تنقیدی پایہ بالکل واضح ہو کر سامنے آ گیا اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس موضوع پر یہ کتاب حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔فارسی شاعری کی امتیازی خصوصیات اور اس کے ارتقائی مدارج کو سمجھنے کے لیے''شعرالعجم'' کی مراجعت ناگزیر ہے۔اس کے علاوہ حسن انشاء کے لحاظ سے بھی اس کتاب کا درجہ بہت بلند ہے اور بعد کے کئی ممتاز اردو تنقید نگاروں نے اس کا اثر قبول کیا ہے۔

''شعرالعجم''پر دو اہم تنقیدیں: شعرالعجم کے محاسن کے ذکر کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر جو تنقیدیں کی گئی ہیں،ان کا بھی دیانت دارانہ جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس میں کتنی صداقت ہے۔ان تنقید نگاروں میں صرف دو اشخاص قابل ذکر ہیں،ایک پروفیسر محمود شیرانی (م ۱۹۴۶ء) اور دوسرے حافظ اسلم جیراج پوری (م ۱۹۵۵ء)۔موخرالذکر نے خود علامہ کی زندگی میں''شعرالعجم''کے ابتدائی دو حصوں پر تنقید کی۔اس وقت تک یہی دو حصے شائع ہوئے تھے۔ان کی یہ تنقید ماہنامہ''زمانہ'' کانپور،شمارہ جون ۱۹۱۰ء،میں شائع ہوئی۔پروفیسر محمود شیرانی نے علامہ شبلی کی وفات کے آٹھ سال بعد یعنی ۱۹۲۲ء میں''شعرالعجم''پر بڑی مبسوط تنقید لکھی جو ۶۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔محمود شیرانی کی یہ تنقید انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ''اردو''(اورنگ آباد دکن)میں اکتوبر ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک

قسطوار شائع ہوئی۔اس وقت چونکہ انجمن کے سکریٹری بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے،اس لیے علامہ شبلی کے مداحوں کے ایک حلقہ میں یہ بدگمانی راہ پاگئی کہ یہ تنقید مولوی صاحب کے اشارے پر علامہ کی علمی و ادبی حیثیت کو مجروح کرنے اور ان کی اس تصنیف کو تاریخی اعتبار سے ساقط الاعتبار بنانے کے لیے لکھی گئی ہے۔اس ''ادبی کار خیر'' میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال بھی شریک تھے۔اس کتاب میں خیام سے متعلق علامہ شبلی کی غلطیوں کی نشاندہی انہی کے قلم سے ہے۔ان کی شرکت سے یہ بات مشکوک ہوجاتی ہے کہ یہ تنقید مولوی عبدالحق کے ایما سے لکھی گئی تھی۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ محمود شیرانی کی تنقید کا ایک بڑا محرک پروفیسر براؤن کی کتاب ''لٹریری ہسٹری آف پرشیا'' پر علامہ شبلی کا جارحانہ تبصرہ تھا،جس کا ذکر اس سے پہلے ہوچکا ہے۔ملحوظ رہے کہ محمود شیرانی براؤن کے علم و فضل کی وجہ سے ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے جیسا کہ ''تنقید شعرالعجم'' کی حسب ذیل عبارت سے بالکل واضح ہے:(۹۳)

> ''براؤن کی تاریخ اس موضوع پر سب سے اعلیٰ تصنیف ہے جو میری نظر سے گذری ہے۔مولانا شبلی نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ہمارے زمانے کی اس بہترین تصنیف کے لیے شبلی کی رائے قابل دید ہے۔فرماتے ہیں''بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا،نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے''۔(۹۴)

پروفیسر براؤن پر علامہ شبلی کے اس تضحیک آمیز تبصرے سے محمود شیرانی کے جذبۂ عقیدت کو ٹھیس پہنچی اور ان کے انتقامی جذبات مشتعل ہوکر ''تنقید شعرالعجم'' کی صورت میں ظاہر ہوئے۔علامہ اقبال بھی کیمبرج میں ان کے شاگرد رہ چکے تھے اور نہایت عزیز شاگرد۔اس لیے قدرتی طور پر وہ بھی علامہ شبلی کے تبصرے سے کبیدہ خاطر تھے۔پروفیسر محمود شیرانی نے ''تنقید شعرالعجم'' کے پیش کلام میں اس کتاب کے لکھنے کی جو وجہ بیان کی ہے وہ ملاحظہ ہو:

> ''تنقید ہذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلت علمی کی منقصت نہیں ہے بلکہ محض احتجاج ہے اس مروجہ روش کے خلاف جس میں ہمارے مصنّفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں۔ہم تاریخی واقعات اور سوانح و حالات لکھتے وقت اس قدر تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ ان کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور ان کی

صحت ودرستی کی طرف سے اطمینان کرلیں۔ میں ان بزرگوں کے ساتھ بھی اتفاق نہیں کرتا جو شعرالعجم کو حسن وعشق کا صحیفہ کہہ کراس کے تاریخی پہلو کی اہمیت گھٹانا اور تنقید کی ضرورت کو اس سے مٹانا چاہتے ہیں''۔(۹۵)

کتاب کے آغاز میں محمود شیرانی نے علامہ شبلی کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی مرحوم زمانہ حال کے ان چند مستند افاضل میں سے ہیں، جن کا وجود مسلمانوں کے لیے ہمیشہ مایۂ ناز رہے گا۔ ان کی متعدد تصانیف نے آسمان علم پر ان کو آفتاب بنا کر چمکا یا ہے۔ مرحوم نے تاریخ نگاری کی بنیاد ایسے زمانے میں ڈالی جب فن تاریخ کا شوق ہمارے دل سے محو ہوچکا تھا، اردو زبان تاریخی کتابوں سے بالکل تہی مایہ تھی۔ فارسی نظم کی تاریخ میں اردو زبان کی بے بضاعتی محسوس کرکے علامہ نے شعرالعجم تصنیف کی۔ اس موضوع پر اب تک فارسی اور اردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، شعرالعجم ان میں بغیر استثناء کے بہترین تالیف مانی جاسکتی ہے''۔(۹۶)

اس اعتراف کمال کے بعد فاضل مصنف ''شعرالعجم'' کے عیوب پر انگلی اٹھائی ہے۔ لکھتے ہیں ''شعرالعجم کے مطالعہ کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوئی ہے کہ علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مورخانہ ومحققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے ہیں، رطب ویابس جو کچھ ان کے مطالعے میں آجاتا ہے بشرطیکہ دلچسپ ہو، حوالۂ قلم کردیتے ہیں، بعض وقت دیکھا جاتا ہے کہ مولانا اپنے پچھلے بیانات کی آگے جاکر خود ہی تردید کرجاتے ہیں، پہلے کچھ رائے قائم کی بعد میں جاکر کوئی اور نظریہ قائم کرلیا۔ ممکن ہے کہ شبلی تاریخ اسلام میں بہتر نظر رکھتے ہوں لیکن شعرائے عجم کے حالات میں ان کے طاقتور قلم نے بہت لغزشیں کی ہیں، اس خاص دائرے میں ان کی معلومات تاریخی نہایت محدود ہے''۔(۹۷)

''شعرالعجم'' پر محمود شیرانی کی اس تنقید پر کئی اصحاب علم کی طرف سے اظہار خیال کیا گیا، موافقت میں بھی اور مخالفت میں بھی۔ علامہ شبلی کے شاگردوں نے بالخصوص اس علمی معرکے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے ترجمان ''معارف'' (فروری ۱۹۲۴ء) میں ''تنقید شعرالعجم'' کے صرف اس حصے پر تبصرہ کیا جس میں خیام کے متعلق علامہ شبلی کی تحقیق

پر ڈاکٹر محمد اقبال کا نقد و تبصرہ ہے۔ یہ تبصرہ بڑا مفصل اور علمی و تحقیقی اعتبار سے نہایت وقیع ہے۔ اس تبصرہ سے علامہ اقبال کے اعتراضات کا تو شافی اور مسکت جواب ہو گیا لیکن سید صاحب نے محمود شیرانی کی تنقید کا جواب نہیں دیا۔ یہ سکوت بتاتا ہے کہ شیرانی کے اعتراضات ان کے نزدیک صحیح تھے۔

اور یہ سچ ہے۔ محمود شیرانی کے بیشتر اعتراضات کا تعلق ''شعر العجم'' کے تاریخی حصے سے ہے یعنی شعراء کے سوانحی حالات۔ ان اعتراضات کو پڑھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ علامہ شبلی نے شعراء کے سوانحی حالات کے لکھنے میں زیادہ تحقیق و جستجو نہیں کی اور چند فارسی تذکروں پر اعتماد کر لیا، جس کے نتیجے میں ان سے متعدد تاریخی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ اگر علامہ نے پروفیسر براؤن کی کتاب کی ابتدائی دو جلدوں کا مکمل ترجمہ کرا کے اس کو غور سے پڑھ لیا ہوتا تو کوئی تاریخی غلطیوں کے ارتکاب سے بچ گئے ہوتے۔ لیکن اپنے علم و مطالعہ پر غیر معمولی اعتماد کی وجہ سے انہوں نے بے اعتنائی برتی۔

ماننا ہوگا کہ ''شعر العجم'' ہی کی طرح محمود شیرانی کی کتاب ''تنقید شعر العجم'' بھی ایک بڑا تنقیدی کارنامہ ہے۔ جناب عبدالماجد دریابادی (۱۹۷۷ء) نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''شعر العجم'' اس میں شک نہیں کہ تاریخ سے زیادہ ادب کی کتاب ہے اور ایک صاحب ذوق مبصر کا کارنامہ ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ تنقید اس کے صرف اسی تاریخی پہلو سے تعلق رکھتی ہے اور اپنے رنگ میں اردو کے ذخیرۂ نقد میں لاجواب اور بے مثال ہے۔ غلطیاں، لغزشیں، فروگذاشتیں، سہو و نسیان، بشریت کا لازمی جزو ہیں، اس سے مفر نہ کسی بلند پایہ مصنف کو، نہ کسی محقق ناقد کو، نہ شبلی نہ شیرانی کو''۔ (۹۸)

مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی (م ۱۹۲۶ء) نے ''تنقید شعر العجم'' پر جو تبصرہ کیا، اس میں اس کتاب کی ستائش کے ساتھ اس کے جارحانہ رویے پر گرفت کی ہے۔ لکھتے ہیں ''شبلی مرحوم کی ''شعر العجم'' پر ایک نہایت ہی محققانہ ریویو نکل رہا ہے، جس کو مرتب کرنے والے حافظ محمود شیرانی اور پروفیسر ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال صاحب ہیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتراضات تمام صحیح ہیں، مگر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ خدا نے ان قابل ریویو نویسوں کو جتنا علم و فضل دیا ہے، اتنا ہی ضبط و تحمل بھی عطا کرتا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، عربی لٹریچر تعقبات سے بھرا پڑا ہے۔ ضخیم کتابیں موجود ہیں۔ مولانا شبلی نے جب

اس مضمون پر قلم اٹھایا ہے وہ منفرد تھے اور تحسین و آفریں کی جو صدائیں بلند ہوئی، ان کے سچے مستحق اور اب ہمارے یہ ریویو نگاران سے زیادہ مرحبا سننے کے اہل ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ جو کچھ پہلے لکھا گیا، لغو اور بے کار تھا''۔(۹۹)

محمود شیرانی کی تنقید سے ''شعرالعجم'' کا صرف تاریخی حصہ (اول و دوم) کسی قدر مجروح ہوا لیکن یہ دونوں حصے (بلکہ تیسرا حصہ بھی) دراصل کتاب کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ خود علامہ شبلی نے جلد چہارم کے دیباچہ میں لکھا ہے اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ محمود شیرانی نے ''شعرالعجم'' کے بقیہ حصوں بالخصوص اس کے چوتھے حصے پر جو دراصل اس کتاب کا مغز و جوہر ہے، کوئی تنقید نہیں کی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اس حصے کی ادبی عظمت سے بخوبی واقف تھے اور غالباً اسی لیے ان کی تنقید جلد دوم سے آگے نہیں بڑھی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس مقام تک پہنچ کر انھوں نے سوچا کہ اردو ادب کے ''بڑے میاں'' کی پگڑی جس حد تک اچھال دی گئی ہے وہ پروفیسر براؤن کی تحقیر کا بدلہ لینے کے لیے کافی ہے۔ یہ فتنہ معاصرت بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس تنقید کے باوجود ''شعرالعجم'' کی شہرت و مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ''تنقید شعرالعجم'' کے جاننے والے بہت تھوڑے ملیں گے لیکن ''شعرالعجم'' سے شاید ہی کوئی اردوداں جو ادبی مذاق رکھتا ہو ناواقف ہوگا۔

جہاں تک حافظ اسلم جیراج پوری کے اعتراضات کا معاملہ ہے، وہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ خاقانی اور ظہوری کو چھوڑ دیا گیا حالانکہ یہ لوگ ایران کے نہایت نامور شاعر تھے، ۲۔ مولانا شبلی نے ہر شاعر کے اشعار تو کثرت سے نقل کیے لیکن اکثر کا اردو ترجمہ نہیں کیا، ۳۔ صرف چند فارسی تذکروں پر بطور ماخذ انحصار کیا گیا جس کی وجہ سے غلطیوں کے علاوہ تاریخی معلومات کی بھی اس میں کمی ہے، ۴۔ بابا طاہر ہمدانی جیسے بزرگ صوفی اور زبردست ایرانی شاعر کا تذکرہ نہیں کیا گیا، ۵۔ دری اور پہلوی شاعری اور ان کے باہمی امتیازات اور اختلافات پر کچھ نہیں لکھا گیا، ۶۔ ایک جگہ ایک قصہ کو کسی کی طرف منسوب کرتے ہیں اور دوسری جگہ اسی قصہ کو کسی اور کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، مثلاً شعرالعجم حصہ اول صفحہ ۶۳ پر قصے کی نسبت محمود کی طرف کی گئی ہے لیکن اسی حصے میں صفحہ ۲۱۱ پر اس روایت کو سلطان سنجر اور امیر معزی کے متعلق لکھ دیا ہے، ۷۔ کبھی ایک شعر کسی کا بتاتے ہیں اور کبھی

کسی اور کا۔ حصہ دوم (ص ۲۵۴) میں یہ شعر: اے گنج نوش دارو در خشمگاں نظر کن الخ سلمان کا بتایا ہے لیکن اس کے چھ ہی صفحہ کے بعد لکھا ہے کہ یہ شعر سعدی کا ہے، ۸۔ فارسی شاعری میں جس چیز کی وجہ سے لطافت اور دلکشی پیدا ہوئی ہے وہ تصوف ہے اور مولانا شبلی کو تصوف سے کوئی مناسبت نہیں۔ تنزلات ستہ کو جو تصوف کا بالکل ابتدائی مسئلہ ہے، ڈارون کے مسئلہ ارتقاء سے ملا دیا ہے، ۹۔ انہوں نے گذشتہ بزرگان دین کا احترام بالکل نہیں کیا ہے، کسی کو امرد پرست کہتے ہیں، کسی کو شراب خور اور کسی کو رندو اوباش اور اس کی بنیاد صرف یہ ہے کہ ان کے اشعار سے ایسا پایا جاتا ہے۔(۱۰۰)

حافظ اسلم جیراج پوری کے مذکورہ کئی اعتراضات بالکل درست ہیں لیکن ہم اس کو تنقید نہیں کہہ سکتے، وہ کھلے طور پر تنقیص ہے۔ انہوں نے تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا ہے۔ اس کے دوسرے رخ سے دانستہ صرف نظر کیا ہے یعنی ''شعرالعجم'' کے محاسن دکھانے سے گریز کیا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ انہوں نے مضمون کے آغاز ہی میں یہ جملہ لکھ کر ''میں صرف اس کے نقائص ہی دکھلانے کی کوشش کروں گا'' ادبی دیانت کا خون کر دیا اور اس سے ان کے دل کا کھوٹ ظاہر ہو گیا یعنی فتنۂ معاصرت۔ اس معاملے میں انہوں نے اتنا غلو کیا کہ اس انتہا کو پہنچ گئے ''اس کتاب پر بالکل سرسری طور پر نگاہ ڈالنے پر بھی بہت سے جزئی عیوب نظر آئے کہ اگر ان سب پر نکتہ چینی کی جائے تو شعرالعجم ہی کے برابر ایک دوسری کتاب تیار ہو سکتی ہے''۔(۱۰۱)

حافظ اسلم صاحب کی تنقید کا دوسرا بڑا عیب وہی ہے جو ''تنقید شعرالعجم'' میں ہے یعنی استہزائی انداز نقد، مثلاً ایک جگہ خواجہ حافظ کے ذکر میں لکھتے ہیں ''اور یہ ایسی بات ہے کہ جس کو ہمارے ہندوستان کے اردو کے غزل گو بچے بھی جانتے ہیں''۔ دوسری جگہ محمود غزنوی کی حمایت میں فرماتے ہیں ''جب ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا شبلی نے کہاں تو الفاروق میں بخاری کی روایت کی تردید میں چوٹی سے ایڑی تک کا زور لگا دیا ہے اور کہاں شعرالعجم میں ایسی بازاری گپیں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں''۔ ایک اور مقام پر علامہ شبلی کی تاریخ دانی کے بارے میں ایک ایسی بات لکھ دی ہے کہ سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے، لکھتے ہیں ''مولانا شبلی نہ صرف محمود اور اس کے زمانے کی تاریخ سے ناواقف ہیں بلکہ یہاں پر مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ ان کو تاریخ کا صحیح مذاق بھی نہیں ملا ہے''۔(۱۰۲)

حافظ اسلم جیراج پوری کے اس مضمون کے جواب میں مہدی حسن افادی (م ۱۹۲۱ء) نے جو

علامہ شبلی کے قدر دانوں میں تھے۔ ایک مضمون بعنوان ''شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر'' لکھ کر ''ترکی بہ ترکی'' جواب دیا یعنی ''ایاز قدر خود بشناس'' (۱۰۳) لیکن مہدی افادی کا یہ غیر شائستہ جواب اسی طرح افسوس ناک ہے جس طرح حافظ اسلم کی غیر علمی تنقید۔

راقم الحروف کے نزدیک ''شعر العجم'' اس بات کی محتاج نہیں کہ کوئی ادیب و نقاد اس کی تحسین کرے تب معلوم ہو کہ وہ ادب و تنقید کا گوہر آبدار ہے: مشک آں است کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔ ''شعر العجم'' کی ادبی و علمی بنیاد اتنی مستحکم ہے کہ معاندانہ تنقید و تنقیص کی ہوائے تند بھی اس میں کوئی تزلزل نہیں پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں کہوں گا کہ ''شعر العجم'' کے تاریخی حصے میں جو غلطیاں ہیں، ان کو دور کرنا بھی ضروری ہے اور یہ کام خود دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ سے وابستہ اہل علم کو کرنا چاہیے۔

حواشی

(۷۷) شعر العجم، ج ۴، ص ۸۹، ۹۰۔ (۷۸) ایضاً، ص ۶۸۔ (۷۹) ایضاً، ج ۱، ص ۲۳۲، ۲۳۳۔ (۸۰) ایضاً، ص ۲۳۴، ۲۳۵۔ (۸۱) ایضاً، ج ۲، ص ۲۲۸۔ (۸۲) ایضاً، ص ۸۳۔ (۸۳) مقالات شبلی (ادبی)، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (طبع پنجم) ۱۹۶۴ء، ج ۲، ص ۷، ۸۔ (۸۴) ایضاً، ص ۷۔ ۱۱۔ (۸۵) ایضاً، ص ۹۔ (۸۶) انتخاب شبلی، ص ۱۳۲، ۱۳۳۔ (۸۷) ایضاً، ص ۱۳۵۔ (۸۸) ایضاً، ص ۱۳۸، ۱۳۹۔ (۸۹) مقالات شبلی (ادبی)، ج ۲، ص ۲۲، ۲۴ (ماخوذ از جمہرۃ البلاغۃ، علامہ حمید الدین فراہی)۔ (۹۰) ایضاً، ج ۲، ص ۱۹ و شعر العجم، ج ۴، ص ۱۰۱۔ (۹۱) شعر العجم، ج ۴، ص ۱۰۴۔ ۱۰۶۔ (۹۲) ایضاً، ص ۱۰۹۔ (۹۳) تنقید شعر العجم، پروفیسر محمود حافظ شیرانی، انجمن ترقی اردو ہند (پہلا ایڈیشن)، ۱۹۴۲ء، ص ۵ (حاشیہ)۔ (۹۴) قوسین کی عبارت شبلی کے ایک خط سے ماخوذ ہے۔ دیکھیں مکاتیب شبلی، مطبع معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۱۷ء، حصہ دوم، ص ۲۴۲۔ (۹۵) تنقید شعر العجم، پیش کلام، ص الف، ب۔ (۹۶) ایضاً، ص ۱، ۲۔ (۹۷) ایضاً، ص ۲۔ (۹۸) ہفت روزہ ''صدق'' لکھنؤ، شمارہ ۱۷/ اپریل ۱۹۴۴۔ (۹۹) ماہنامہ ''دل گداز'' لکھنؤ، شمارہ ۶/ جون ۱۹۲۳ء۔ (۱۰۰) ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور، شمارہ جون ۱۹۱۰ء۔ (۱۰۱) ایضاً۔ (۱۰۲) ایضاً۔ (۱۰۳) تفصیل کے لیے دیکھیں: افادات مہدی، ص ۱۵۶ تا ۱۷۳۔

پیغمبر اسلام کی بارگاہ میں غیر مسلم شعراء کا خراج احترام

ڈاکٹر راہی فدائی

نعت شریف کے سلسلہ میں عام طور پر اہل علم کا یہ رجحان ہے کہ ان کے نزدیک نعت پاک کہنے والے شعراء حضور اکرمؐ کی عقیدت و محبت میں ڈوبے ہوئے رہتے ہیں اور ان کا ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک مصرع عشق رسولؐ کی نشاندہی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور ان کے خیال میں شاعر نعتوں میں جس قدر وارفتگی کا اظہار کرے گا اسی قدر اس کے اشعار میں تاثیر پیدا ہوگی، یہی سبب ہے کہ شعر کو دلی جذبات کا آئینہ کہا گیا ہے اور ایسے موقع پر ہی ''از دل خیزد بر دل ریزد'' (دل سے نکلنے والی بات ضرور دل پر اثر کرتی ہے) کا مقولہ استعمال کیا جاتا ہے۔

راقم الحروف اسلامیات و ادبیات کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ حضور پرنورؐ سے عشق و محبت ایمان کی سلامتی کے لیے لازم و شرط اولین ہے نہ کہ نعت گوئی کے لیے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں مروی ہے:

لا یؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین (متفق علیہ)	یعنی تم میں سے کوئی بھی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ میں (رسول اللہؐ) اس کی ذات، اس کے ماں باپ، اس کی اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ اس کا محبوب نہ رہوں۔

نعت گوئی کے لیے شرط یہ ہے کہ شاعر کو فن شاعری پر دسترس حاصل ہو اور وہ اپنے ممدوح کے

بنگلور، کرناٹک۔

اوصاف وکمالات کا بخوبی علم وادراک رکھتا ہو، پھر اس علم کو جذبہ میں اور جذبہ کو شعر میں تبدیل کرنے کا میلان طبع اپنے اندر پاتا ہوتو اس کی کہی ہوئی نعتوں میں دل کشی اور اثر انگیزی پیدا ہوگی۔مزید براں اگر وہ لفظوں کی معنویت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صنائع و بدائع کا استعمال اپنے اشعار میں مناسب طور پر کرے تو اثر آفرینی میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور یہ تاثر تا دیر قائم بھی رہے گا۔

غرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی شاعر کا نعتیہ کلام پڑھتے یا سنتے ہیں اور وہ دل کو چھوجاتا ہے تو فوراً کہہ اٹھتے ہیں شاعر نے آپؐ کے عشق میں ڈوب کر شعر کہا ہے۔حالانکہ حقیقت حال ایسی نہیں ہوتی ہے، چنانچہ بعض نعت گو شعراء ایسے بھی ہیں جنہیں آنحضرتؐ کی سنتوں کی پیروی کا خیال تو کجا اسلام کے فرائض و واجبات کا بھی لحاظ نہیں رہتا مگر وہ بہترین نعتیہ اشعار کہہ رہے ہیں اور "لم تقولون مالا تفعلون" کی منہ بولتی تصویر پیش کرر ہے ہیں۔اگر واقعتاً وہ "حب رسولؐ" میں غرق رہتے تو بہ مصداق "الاناء یترشح بما فیه" یعنی برتن وہی چیز انڈیلتا ہے جو اس میں موجود ہے، ان کا ظاہر بھی باطن کا عکس جمیل ہوتا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ نعت پاک کی طرف شاعر کا میلان اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسے آنحضرتؐ کی مقدس ذات واعلیٰ صفات سے کسی نہ کسی حد تک لگاؤ اور تعلق ہے جس کے زیر اثر وہ نعت کہنے پر آمادہ ہوا ہے۔اس لگاؤ اور ربط و تعلق کی تعبیر "عشق رسولؐ" جیسے پر معنی و پروقار لفظ سے کرنے کی بجائے چاہت اور احترام کے الفاظ سے کریں تو مناسب ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت کے کئی درجے ہیں، اس کا اعلیٰ درجہ عشق ہے اور ادنیٰ درجہ احترام۔اسی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہت سارے شعرائے کرام نے نعتیں کہی ہے، جن میں غیر مسلم شعراء کی تعداد بھی معتد بہ ہے۔ ان غیر مسلم شعراء کے یہاں حضور اکرمؐ کی شان اقدس میں رطب اللسان ہونے کا جذبہ اسی احترام کے راستے سے درآیا ہے جسے احترام انسانیت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے، کیونکہ آپؐ تمام اقوام عالم کے اہل علم و فضل اور اصحاب دانش وبینش کے نزدیک "انسان کامل" ہیں۔آپؐ کا اسوۂ حسنہ اور آپؐ کے عظیم اخلاق دوست ودشمن، اپنا پرایا اور ادنیٰ و اعلیٰ سبھی کے حق میں یکساں ہیں، یہی سبب ہے کہ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم اہل سخن بھی آپؐ سے متاثر ومرعوب ہیں۔اس تاثر کے پیش نظر جناب پنڈت بال مکند عرش ملسیانی (ولادت ۱۹۰۸ـ وفات ۱۹۷۹ء) ابن وتلمیذ جوش ملسیانی نے کیا خوب کہا ہے:

حاصلِ جلوۂ ازل ، پیکرِ نورِ ذات توؐ شانِ پیمبری سے ہے سرورِ کائنات توؐ

آنحضرتؐ کی حیات طیبہ، آپؐ کے مبارک و مقدس عادات و اطوار اور آپؐ کے شمائل و فضائل سے متاثر ہوکر پروفیسر تلوک چند محروم (۱۸۸۷ء۔۱۹۶۶ء) نے یہ اقرار کیا ہے:

مبارک پیشرو جس کی ہے شفقت دوست و دشمن پر مبارک پیش رو جس کا ہے سینہ صاف کینے سے

آپؐ کی سیرت پاک کے مطالعہ سے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (ولادت ۱۹۰۹ء) کا جذبۂ احترام چاہت اور محبت میں بدل گیا، چنانچہ کہتے ہیں:

تکمیل معرفت ہے محبت رسولؐ کی ہے بندگی خدا کی ، اطاعت رسولؐ کی
عشق ہوجائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں کچھ مسلماں کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

آخرالذکر شعر کے مضمون کو چندر پرکاش جوہر بجنوری (ولادت ۱۹۲۳ء) نے اس طرح ادا کیا ہے:

نہیں ذکر محمدؐ کے لیے تخصیص مذہب کی
یہ کس نے کہہ دیا، یہ صرف مسلم کی زباں تک ہے

اسی طرح جناب جوش ملسیانی کے شاگرد کالی داس گپتا رضا (ولادت ۱۹۲۵ء) کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

جام و مینا سے نہیں ہم کو سروکار مگر آپؐ کے نام سے آجائے تو مستی اچھی

پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی (ولادت ۱۹۷۶ء) کے ایک شاگرد امیر چند قیسی جالندھری کا یہ اعتراف بھی خوب ہے:

حیات سادہ کے اسباق دے کے عالم کو تکلفات کے پردے اٹھا دیے تو نے

حضور پرنورؐ کے بلند ترین اخلاق اور اعلی و ارفع اقدار سے متاثر ہوکر کرشن بہار نور نے خود کو آپؐ کے قدموں میں ڈال دیا اور اس عمل کو اپنی معراج قرار دیا، اس طرح انہوں نے اپنے تخلص نور کا گویا حق ادا کیا۔ ان کا قطعہ

دیر سے نور چلا اور حرم تک پہنچا سلسلہ میرے گناہوں کا کرم تک پہنچا
تیری معراج محمدؐ تو خدا ہی جانے میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی (۱۸۶۶۔۱۹۵۵ء) تلمیذ شمس العلماء الطاف حسین حالی (متوفی ۱۹۱۵ء) حضور اکرمؐ کے حسن گفتار و بلندیٔ کردار پر اس قدر وارفتہ ہوئے کہ انہوں نے محسوس کیا، ان کے

پاس سب کچھ موجود ہے مگر ایک چیز کی کمی ہے جس کے بغیر زندگی لایعنی سی لگتی ہے، وہ ہے دل کی تاریکی کو دور کرنے کا واحد ذریعہ "نورایمانی"۔ اسی کی آرزو میں حضرت کیفی نے بارگاہ الٰہی میں یہ دعا کی

یوں روشنی ایمان کی دے دل میں کہ جیسے بطحیٰ سے ہوا جلوہ فگن نورؐ خدا کا (۱)

آپؐ کے مقدس حالات وکمالات کا تہ دل سے اعتراف کرتے ہوئے جناب بابو برج گوپی ناتھ صائب بیکل امرتسری نے کس عمدگی سے اپنے جذبات کا اظہار نظم مسدس میں کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

اے رسول پاک ، اے پیغمبر عالی وقار
چشم باطن بیں نے دیکھی تجھ میں شانِ کردگار
تیرے دم سے گل نظر آئے رہ عرفاں کے خار
خوبیوں کا ہو تری کیونکر بھلا ہم سے شمار
نور سے تیرے اندھیرے میں درخشانی ہوئی
تیرے آگے آبرو کفار کی پانی ہوئی

اک جہالت کی گھٹا تھی چار سو چھائی ہوئی
ہر طرف خلق خدا پھرتی تھی گھبرائی ہوئی
شاخ دیدار کی بھی بے طرح مرجھائی ہوئی
لہلہا اٹھی تری جب جلوہ آرائی ہوئی
تیرے دم سے ہوگئیں تاریکیاں سب منتشر
پاگئی راحت ترے آنے سے چشم منتظر

کیوں نہ ہم بھی اس جہاں کا پیشوا مانیں تجھے
کیوں نہ راہ حق میں اپنا رہنما مانیں تجھے
دیکھنے دے خدا آنکھیں تو پہچانیں تجھے
حق کی ہے بیکل صدا شمس الضحیٰ مانیں تجھے
گو مسلمانوں کا اک پیغمبر اعظم ہے تو
اپنی آنکھوں میں بھی اک اوتار سے کب کم ہے تو (۲)

بیکل امرتسری کے آخری بند کے آخری شعر پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ ہندو حضرات کے یہاں جو''اوتار'' کا عقیدہ ہے اس کی ترجمانی شاعر نے اپنے شعر

گو مسلمانوں کا اک پیغمبر اعظم ہے تو اپنی آنکھوں میں بھی اک اوتار سے کب کم ہے تو

میں کی ہے۔ ان کے مذہب میں ''اوتار'' کا عقیدہ یہی ہے جتنے مہا پرش اور مقدس ہستیاں ہیں، وہ سب بھگوان اور خدا کے نہ صرف مظاہر ہیں بلکہ ''اوتار'' ہیں۔ یعنی ان بزرگوں میں نعوذ باللہ خدا حلول کیے ہوئے ہے۔ یہاں یہ فرق ملحوظ رہے کہ ''اوتار'' کا اعتقاد اسلام میں صریح کفر و باطل ہے اور مظاہر حق ہونے کا اعتقاد صحیح اور درست ہے۔ ایک مومن کامل رب تعالیٰ کا مظہر جمیل اور اس کی قدرت کا عکس حسین ہوتا ہے، جس کے اشارے قرآن پاک اور حدیث شریف میں پائے جاتے ہیں اور یہ حقیقت اہل علم و عرفان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے، اس مقام پر تفصیل غیر ضروری ہے۔

راقم نے مقالہ کی تمہید میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ غیر مسلم شعراء حضور اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ اور آپؐ کی منور و مبارک شخصیت سے متاثر ہوکر آپؐ کی چاہت و احترام میں نعت گوئی پر از خود آمادہ ہوجاتے ہیں اور آپؐ کی ثنا خوانی و مدح سرائی میں رطب اللسان ہونے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اس جذبہ و احساس کو عشق و محبت کا نام دینا اور اس شاعری کو عشقیہ شاعری کہنا جیسا کہ ہمارے عام نقادوں کا خیال ہے، غیر حقیقی رویہ بھی ہے اور بعید از قیاس رجحان بھی، اگر واقعتاً حضور اکرمؐ کی ذات اقدس سے ان غیر مسلم شعراء کا عشق سچا اور پکا ہوتو ضرور انہیں حلقہ بگوش اسلام ہونے کی توفیق ملی ہوتی۔ اس بات کا انہیں خوب علم ہے کہ وہ اسلام کے عقیدۂ توحید پر نہیں ہیں اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپؐ کی بھرپور تعریف و توصیف کرنے کے باوجود اصل دین و توحید الٰہی کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں کہلاتا اور اسے دیار رسولؐ کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وہ احساس ہے جس نے شاعر کو درج ذیل شعر کہنے پر مجبور کردیا، ٹھاکر دامودر ذکی محبوب نگری (تلنگانہ) شاگرد ازل لاہوری و حبیب اللہ وفا حیدرآبادی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۶ء) نے اپنی شدید خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے:

اتنی سکت کہاں ہے میں آسکوں وہاں تک تو خواب میں تو آجا اک بار اے مدینہ

زیارت مدینہ منورہ کی آرزو میں بابو روشن لعل صاحب نعیم ڈیرہ غازی خاں نے اپنے جذبات و تصورات کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا ہے:

للّٰہ بلا لیجیے سرکارِ مدینہ مرجائے نہ یہ ہند میں بیمارِ مدینہ

حسرت ہے کہ دم نکلے درِ شاہِ عرب پر مدفن ہو تہہِ سایۂ دیوارِ مدینہ

اے شیخ تجھی کو رہِ فردوس مبارک کافی ہے مجھے گوشۂ گلزارِ مدینہ

مرجائے نعیم الفتِ سرورؐ میں الٰہی تعویذِ لحد ہو درِ دربارِ مدینہ(۳)

اولین نعت گو غیر مسلم شاعر: دکن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ جس طرح اردو زبان کے اولین شاعر حضرت بندہ نواز گیسودراز (۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء/ ۸۲۵ھ مطابق ۱۴۲۱ء) گلبرگہ کی سرزمین میں آسودہ ہیں اسی طرح اردو کے اولین نعت گو غیر مسلم شاعر جن کا نام نامی ایکناتھ مہاراج ہے، دکن ہی کی خاک سے اٹھے ہیں۔ ایکناتھ جی مہاراشٹر کے متوطن تھے۔ مراٹھی کے قدیم واہم شعراء میں مہاراج کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے مراٹھی کی صنف شاعری ''بھاروڑ'' میں خوب طبع آزمائی کی ہے، ایک سنت ہونے کے اعتبار سے ان کا کلام عوام وخواص میں مشہور ہے۔ ایکناتھ جی کی ولادت حضرت بندہ نواز کے وصال کے ایک صدی بعد (۱۵۳۳۔۱۵۹۹ء) ہوئی تھی۔ مشہور محقق وادیب ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط صاحب نے ایکناتھ جی کو کھوج نکالا ہے، ان کی نعتیہ شاعری پہلی بار ڈاکٹر نشیط کے توسط سے اہل علم میں روشناس ہوئی ہے۔ ایکناتھ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

خیال کیا ، مچھلی والے ولیکن دریا و ڈھونڈے گوِند محمدؐ
کھیل کھلانے آیا محمدؐ

دشرتھ ، رام رانا و لیکن دیو چھڑاوے بند محمدؐ
کھیل کھلانے آیا محمدؐ

لنکا پتی راون مارا و لیکن راجیہ دیا بھبیشن محمدؐ
کھیل کھلانے آیا محمدؐ (۴)

اردو میں غیر مسلم نعت گو شعراء کی تعداد سینکڑوں میں ہے، جن میں سے بعض منتخب شعراء کو تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے تاکہ بارگاہ رسالت مآبؐ میں خراج احترام ونذرانۂ عقیدت گزارنے والوں کے جذبات واحساسات کی کماحقہ قدر افزائی ہوسکے اور ساتھ ہی ان کے اسلوب ادا اور طرز سخن کا کسی قدر اندازہ بھی لگایا جاسکے، راقم کی گذارش ہے کہ منصب نقد وانتقاد پر فائز حضرات

نعت کی وسعت ووقعت، اس کے تنوع وترفع اوراس کی رنگارنگی و ہمہ جہتی کا صحیح ادراک کرتے ہوئے نعت گوشعراء کوان کا مناسب مقام ومرتبہ دینے میں تکلفات وتعصّبات سے کام نہ لیں۔

۱۔عاشق دہلوی، مہارانہ کلیان سنگھ (۱۷۴۹۔۱۸۲۲ء):

یہ لکھتے ہے نعتِ رسولؐ خدا مغیث الوراؐ خواجۂ دوسرا
محمدؐ ہیں محبوبِ پروردگار محمدؐ ہیں مطلوبِ پروردگار (۵)

۲۔ساقی سہارن پوری، منشی شنکرلال ولد خوب چند (۱۸۶۰۔۱۸۹۰ء) تلمیذ منشی لال کمند بے صبر (وفات ۱۸۸۵ء) وفیض یافتۂ مرزا غالب ومنشی تفتہ:

مرا ہر لفظ نعتِ احمدیؐ سے درّ یکتا ہے لکھا جو دائرہ ہے وہ مہِ کامل کا ہالا ہے
صفاتِ ذات احمدؐ لکھ سکوں کیا میری طاقت ہے خیال اہلِ دانش جب یہاں مکڑی کا جالا ہے
نعت لکھتا ہوں مگر شرم مجھے آتی ہے کیا مری انؐ کے مدح خوانوں میں پیشی ہوگی

ساقی نے کفر وشرک کے خلاف بلا تکلف لکھا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کا کلام نہیں بلکہ خداترس مومن کا کلام ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

ہوئی کافور نورِ مصطفیٰؐ سے شرک کی ظلمت سیاہی سے ندامت کی دلِ کفار کالا ہے (۶)

۳۔ساحر دہلوی پنڈت امرناتھ مون (۱۸۶۳۔۱۹۴۲ء) وظیفہ یاب ڈپٹی کلکٹر:

مرا قلب مطلعِ نور ہے کہ حرم میں جلوۂ یار ہے دل ودیدہ محوِ نظارہ ہیں کہ نہ گرد ہے نہ غبار ہے
بے سایہ نور باعث ایجاد و مغفرت جس کے وجودِ جود سے رحمت نہال ہے
امت کا اپنی شافعِ روز جزا بنا اب پرسشِ جواب نہ روئے سوال ہے (۷)

۴۔شاد، مہاراجہ کشن پرشاد ولد راجہ ہری کشن پرشاد (۱۸۶۴۔۱۹۴۰ء) وزیر اعظم سلطنت آصفیہ، حیدرآباد، صاحب مجموعہ نعت ''ہدیہ شاد'' (مطبوعہ ۱۳۲۶ھ)۔ شاد صاحب کے کلام سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ یہ ایک غیر مسلم کا کلام ہے۔ وہ نعت گوئی کی توفیق پر خدائے تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہوئے کہتے ہیں:

مشغلہ نعتِ نبیؐ کا ہے مجھے شکرِ خدا بعد مدت کے یہ ہاتھ آیا ہے مقصد مجھ کو

شاد کی وارفتگی اور جذبات کی فراوانی کا عالم دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ رب تعالیٰ اپنے محبوبؐ کی

ثناخوانی کس کس زبان وکس کس قلم سے کروارہا ہے اور کن کن زاویوں سے رسول اکرمؐ کی مدح سرائی ہورہی ہے۔مہاراجہ شاد کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کافر عشق محمدؐ خلق کہتی ہے مجھے سب مسلماں قدر کرتے ہیں مرے زنّار کی

کافر ہوں کہ مومن ہوں،خدا جانے میں کیا ہوں پر بندہ ہوں ان کا جو ہیں سلطانِ مدینہؐ

ہم خیالِ رخِ پُرنور میں حیراں ہوں گے یاد آئیں گے جو گیسو تو پریشاں ہوں گے

لے گیا بخت اگر روضۂ اقدس کی طرف جان ودل سے کبھی صدقے کبھی قرباں ہوں گے

ہم کو تو گلشنِ طیبہ میں اڑا کر لے جا ہم ترے باد صبا ، بندۂ احساں ہوں گے

جب سے وحدت کا ہوا دل میں خیال تھا جو بیگانہ ، یگانہ ہوگیا

کفر چھوڑا پی کے مئے توحید کی رنگ شادؔ اب عاشقانہ ہوگیا(۸)

۵۔کوثری،چودھری دلورام ولد بھورارام حصاری (۱۸۸۲۔۱۹۳۳ء) اردو کے ممتاز نعت گو شاعر ہیں،جنہیں پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری نے ''حسان الہند'' کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا۔کوثری نے دولت ایمانی سے محرومی کے باوجود حضور اکرمؐ کی بارگاہ اقدس میں نعتوں کا نذرانہ پیش کیا،آل اطہار واصحاب کبار کی منقبتیں لکھیں اور اسلامی روایات پر بہترین نظمیں قلم بند کیں۔زندگی بھر یہی مشغلہ رہا،حیدرآباد،بھوپال،رامپور وغیرہ درباروں میں انہیں نعت خوانی کی دعوت دی جاتی تھی اور ان کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔کوثری نے کیا خوب کہا ہے:

کرائے ہندو بیاں اس طرز سے تو وصف احمدؐ کا مسلماں مان جائیں لوہا سب تیغِ مہند کا

محمدؐ اور دِلّو رام میں نقطہ نہیں کوئی کہ ہے مداح اور ممدوح میں یہ ربط کس حد کا

دِلّو رام کوثری کو یہ اعتماد ہے کہ دوزخ کی آگ انہیں جلائے گی نہیں،کیونکہ وہ مداح نبیؐ ہیں، جس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے:

ہندو سمجھ کے مجھ کو جہنم نے دی صدا میں پاس جب گیا تو نہ مجھ کو جلا سکا

بولا کہ تجھ پہ کیوں مری آتش ہوئی حرام کیا وجہ تجھ پہ شعلہ جو قابو نہ پاسکا

میں نے کہا کہ جائے تعجب نہیں ذرا واقف نہیں تو میرے دلِ حق شناس کا

انہیں یقین ہے کہ رسول اکرمؐ کی معیت حاصل ہوگی،جس کے وسیلے سے خدائے رب العزت

کا ساتھ میسر آئے گا۔ چنانچہ وہ اس طرح رقم طراز ہیں:

کوثری تنہا نہیں ہے مصطفیؐ کے ساتھ ہے جو نبیؐ کے ساتھ ہے وہ کبریا کے ساتھ ہے
لے کے دِلّو رام کو حضرت گئے جنت میں جب غُل ہوا ہندو بھی محبوب خدا کے ساتھ ہے(۹)

۶۔ فلک لاہوری، لالہ لال چند، تلمیذ دوارکا پرساد افق لکھنوی (۱۸۷۷۔۱۹۶۷ء):

نغمۂ وحدت حق دہر میں گایا تونے کملیؐ والے یہ عجب گیت سنایا تونے
رب بے مثل کا دنیا میں بٹھا کر سکہ نقش ، اوہام پرستی کا مٹایا تونے
ریت کے ذروں کو بارود کی طاقت بخشی خاکِ ناچیز کو اکسیر بنایا تونے
گنبد و سقفِ فلک، گوش زمیں گونج اٹھے کوسِ توحید عرب میں جب بجایا تونے(۱۰)

۷۔ جواں سندیلوی، منی لال، تلمیذ ہنر سندیلوی و آرزو لکھنوی (۱۸۸۹۔۱۹۷۴ء) کے مسدس کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں، جس میں انہوں نے واقعہ معراج کو کس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے:

آج کیا ہے جو سجاوٹ ہے سرِ چرخِ بریں چاندنی رات بھی دلکش ہے، ستارے بھی حسیں
نور ہی نور ہے ظلمت کا کہیں نام نہیں قابلِ دید ہے گلزارِ جناں کی تزئیں
حکم خالق ہے، فرشتے سبھی ہوشیار رہیں مرے محبوبؐ کی تعظیم کو تیار رہیں(۱۱)

۸۔ جوہر بلگرامی، شنکر سہائے ولد بابو سری واستو (۱۸۹۰۔۱۹۷۱ء) منصف و ناظم دیوانی و فوج داری، حیدرآباد دکن:

یوں تو دنیا میں بہت سے ہوئے مولیٰ والے پر تریؐ شان ہی کچھ اور تھی بطحیٰ والے
تو وہ مخلوق کہ خالق تری تخلیق پہ خوش بعد مولیٰ تجھےؐ کیوں مانیں نہ مولیٰ والے
آئے گا سوا نیزے پر جب نیر اعظم ہم ہوں گے تہِ دامنِ سلطانِؐ مدینہ(۱۲)

۹۔ جذب رائے چوری، پنڈت رگھوندر راؤ، تلمیذ ترکی و شوکت میرٹھی (۱۸۹۴۔۱۹۷۳ء) ایڈوکیٹ:

لکھتا ہوں ثنائے رخِ نیکوئے محمدؐ روکش خورشید فلک روئے محمدؐ
مکے سے مدینہ سے ہی پہنچی سرِ افلاک بوئے گل رخسارہ و گیسوئے محمدؐ
اس جذب دل افگار کو رویا میں کسی شب یا رب تو دکھا دے رخ نیکوئے محمدؐ(۱۳)

۱۰۔ سامی جبل پوری، منشی مہادیو پرساد تلمیذ مضطر خیرآبادی (۱۸۹۵۔۱۹۷۱ء) بڑے

پرگو شاعر گذرے ہیں، سامی نے آقائے نامدارؐ کی مدحت وثنا کرتے ہوئے قربت رسول اکرمؐ کی تمنا میں خود کو وقف کیا ہے اور اپنے گناہوں کی مغفرت بھی طلب کی ہے۔ سامی اپنا مدعی پیش کرتے ہوئے عرض گزار ہیں:

جنت کی سمت رخ نہ کروں آپؐ کے بغیر — حضرتؐ کا ہوں گدا تو طبیعت غیور ہے
ممکن ہے مدح کس سے ہو اس ذات پاک کی — مدحت طراز جس کا خدائے غفور ہے
کافی ہے یہ نصیحت اغیار کے لیے — وہ دور ہے خدا سے، نبیؐ سے جو دور ہے
مقصود عرض حال ہے ورنہ غلام کو — دعویٰ کلام کا نہ زباں کا غرور ہے
خادم کا بال بال گنہگار ہے تو ہو — مداح ہے حضورؐ کا اتنا ضرور ہے
لاکھوں خطائیں کی ہیں بس اتنی امید پر — حضرتؐ بھی ہیں کریم، خدا بھی غفور ہے
محشر میں دیکھ لیں گے جنہیں اشتباہ ہو — سامی ہے اور جامِ شرابِ طہور ہے

جناب سامی نے مقطع کے بعد ایک تاریخی شعر رقم کیا ہے، جس میں اس واقعہ کا سن ہے جبکہ جبل پور میں ۶رشعبان ۱۳۴۵ھ مطابق فروری ۱۹۲۷ء کو بعد مغرب ایک روشن ستارہ ٹوٹا اور وہ صاف طور پر آپؐ کا اسم گرامی ''محمدؐ'' کی شکل اختیار کر گیا، اس نظارہ سے بہت سارے خوش نصیب بہرہ ور ہوئے، اسی کی طرف سامی نے اپنے دو شعر میں اشارہ کیا ہے:

تارے سے نامِ نامیٔ حضرت عیاں ہوا — یہ معجزہ حضور کرامت ظہور ہے
تھی مجھ کو فکرِ سال کہ ہاتف نے دی ندا — لوحِ فلک پہ جلوۂ نامِ حضورؐ ہے (۱۴)

۱۱۔ حامی بریلوی، بشن نارائن ولد پنڈت دیبی پرشاد صادق بریلوی (ولادت تقریباً ۱۸۹۶ء) صاحب دیوان شاعر تھے، شاعری انہیں ورثہ میں ملی تھی، تاریخ روہیل کھنڈ مع تاریخ بریلی کے مولف مولانا عبدالعزیز خان بریلوی نے جناب حامی کی خوب تعریف کی ہے:

ہو کیوں نہ بشر تابعِ فرمانِ محمدؐ — فردوس میں جائیں گے غلامانِ محمدؐ
عاشق تپشِ مہر قیامت سے ڈریں کیوں — کافی ہے انہیں سایہ دامانِ محمدؐ
از بسکہ گنہگار ہوں، محشر میں الٰہی — چھوٹے نہ مرے ہاتھ سے دامانِ محمدؐ
بخشیں مجھے توفیق اگر نعت کی حامیؔ — بھولوں نہ کبھی عمر بھر احسانِ محمدؐ (۱۵)

۱۲۔اختر ہوشیار پوری، پنڈت ہری چند تلمیذ حفیظ جالندھری (۱۹۰۰۔۱۹۵۸ء) کو اپنے وسعت مشرب پر فخر ہے اور وہ تصور میں سبز گنبد کی زیارت سے مشرف ہو کر انتہائی خوش ہیں۔

وسعتِ مشرب سے ہیں اک مخزن اسرار ہم	کفر ہم ، اسلام ہم ، تسبیح ہم زنّار ہم
سبز گنبد کے اشارے کھینچ لائے ہیں ہمیں	لیجیے دربار میں حاضر ہیں اے سرکار ہم
نام پاک احمدِ مرسلؐ سے ہم کو پیار ہے	اس لیے لکھتے ہیں اختر نعت میں اشعار ہم (۱۶)

۱۳۔باغ اکبر آبادی، حکیم بال کشن داس ولد حکیم ہنومان سہائے تلمیذ حضرت سید محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی و فلک حیدر آبادی (۱۹۰۶۔۱۹۵۹ء) بڑے شائستہ وشستہ مذاق کے حامل تھے، حکیم باغ صاحب کی نعتوں میں دلکشی و دل آویزی موجود ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

رہا کرتا ہے اس میں جلوۂ یکتا محمدؐ کا	مرا دل ہے ازل سے آئینہ خانہ محمدؐ کا
گلہ غم کا نہیں، غم دینے والے یہ شکایت ہے	جو تجھ کو غم ہی دینا تھا، تو غم دیتا محمدؐ کا
اگر تجھ کو محبت ہے جو تیرا عشق صادق ہے	تو آنکھیں بند کر کے کھینچ لے نقشہ محمدؐ کا (۱۷)

۱۴۔دل کشمیری، منوہر لال ولد گوندامل آنند شاگرد اثر لکھنوی و جوش ملسیانی (ولادت ۱۹۱۲ء) مصنف مجموعۂ کلام ''نقد دل'' (مطبوعہ ۱۹۷۳ء) دل اسٹیٹ بینک آف انڈیا جموں کے اعلی عہدے پر فائز ہو کر وظیفہ یاب ہوئے، دل صاحب نے جموں میں ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی، جو اولاً ''بزم سخن'' کے نام سے اور بعد میں ''بزم اردو'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ دل حضور اکرمؐ کے اخلاق کریمانہ کی تعریف و توصیف میں اس طرح رطب اللسان ہیں:

آقا جو محمدؐ ہے عرب اور عجم کا	بے مثل نمونہ ہے مروت کا کرم کا
حاصل ہے جنہیں تیرے غلاموں کی غلامی	لیتے نہیں وہ نام کبھی قیصر و جم کا
فردوس نظر ہے ترے مسکن کی زیارت	روضہ ترا دنیا میں بدل باغ ارم کا
کیا دل سے یہاں ہو تیرے اخلاق کی توصیف	عالم ہوا مداح تیرے لطف و کرم کا (۱۸)

۱۵۔مکھن حیدر آبادی، راجہ مکھن لال (وفات مابعد ۱۸۴۴ء) صاحب دیوان شاعر تھے، جن کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ ''گورنمنٹ مینو اسکرپٹ لائبریری'' کی زینت ہے۔ انہوں نے نعتیں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کہی ہیں۔ ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۱ء میں عمر خیام کی رباعیات کا منظوم

ترجمہ صنف رباعی ہی میں کیا، مکھن لال کو حضور اکرمؐ سے بے پایاں عقیدت تھی، اس لیے آپؐ کی شفاعت کی آرزو میں اشعار کہے ہیں:

بسکہ تو نے کیا ہے جرم عظیم　　جا پکڑ دامنِ شفیعِ رحیم
عرض کر بندگی بصد تعظیم　　بول اپنا پکار حال سقیم
کر مدد مجھ پہ یا رسول اللہ　　تا نہ دیکھو عذاب نارِ جحیم(۱۹)

۱۶۔ رونق دہلوی، منشی پیارے لال تلمیذ راسخ دہلوی (وفات ۱۹۳۴ء) بلند پایہ شاعر تھے، زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی، نعتوں میں طباعی کا مظاہرہ خوب کیا ہے:

کلمہ صلِّ علی وردِ زباں رکھتا ہوں　　خواب میں دیکھ لیا ہے قدِ بالا تیرا
عفو ہو جائیں گی محشر میں خطائیں ساری　　داورِ حشر کو دوں گا میں حوالا تیرا
آہ کر ہجر محمدؐ میں سنبھل کر اے دل　　عرش کے پار نکل جائے گا نالا تیرا(۲۰)

۱۷۔ منظر، ڈاکٹر کے، مدنا منظر تما پوری ابن پربھوراؤ (۱۹۲۰۔۱۹۸۲ء) سول سرجن ہونے کے باوجود فطرتاً صوفی منش تھے۔ اردو، ہندی، کنڑی اور انگریزی میں شعر کہتے تھے۔ اردو شاعری میں نعتوں کی طرف ان کا میلان زیادہ تھا۔ حضور اکرمؐ کی شان یکتائی میں شعر کہتے ہوئے ان پر محویت کا عالم طاری رہتا تھا۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب کے اشعار میں تاثیر کا عنصر نمایاں ہے:

تمہارے چہرۂ زیبا کو ہم قرآں سمجھتے ہیں　　تمہاری ہر ادا کو معنیٔ فرقاں سمجھتے ہیں
تمہارے عشق میں جینا، تمہارے عشق میں مرنا　　اسے ہم دین کہتے ہیں، اسے ایماں سمجھتے ہیں
الٰہی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آئے　　کروں سجدہ جہاں نقشِ کفِ پا ہو محمدؐ کا(۲۱)

حضور پرنورؐ کی بارگاہ اقدس میں خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور آج بھی بہت سارے غیر مسلم شعراء اس پاک شغل میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اسے اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ ان شعراء میں جناب چندر بھان خیال (ولادت ۱۹۴۶ء) اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے "لولاک" (مطبوعہ ۲۰۰۲ء) کے نام سے منظوم سیرت طیبہ تحریر کی، خیال صاحب اولین غیر مسلم منظوم سیرت نگار ہیں۔ "لولاک" کے چند بند ملاحظہ ہوں:

اوج بخش و بخت آور، نام تھا محمدؐ کا　　آسروں نے ڈھونڈا تھا آسرا محمدؐ کا

رفعتوں کی خاموشی ، وسعتوں کی تاریکی ختم ہوگئی جیسے مصطفےؐ کی آمد پر
برق سی گری اک دم واہموں کے برگد پر ہل اٹھا نظام شر خیر کی اس آمد پر
جذبہ صداقت اب زندگی کے صحرا میں چہچہاتی چڑیوں سا چہچہاتے پھرتا تھا

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور حضور اکرمؐ کی شان اقدس کا کرشمہ ہے کہ آج کے لسانی ومذہبی تعصب کے زمانے میں بھی اردو کے غیر مسلم شعراء ہی نہیں بلکہ ہندی کے غیر مسلم شعراء بھی نعتیں کہنے کو اپنی خوش قسمتی تصور کررہے ہیں، جس کی ایک مثال جواں سال شاعر گیان چندمرملیا بنگلور (ولادت ۱۹۵۹ء) کی ہے، جن کا کلام ہندی رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ دیکھیے کہ مرملیاؔ کے یہ شعر کس قدر سادگی وشائستگی کا نمونہ ہیں:

کرنے دو مجھے صاحب ایمان کو سلام حضرت رسولؐ پاکِ مہربان کو سلام
جب آپؐ نے انسانیت کی راہ دکھائی انسان بھی کرنے لگے انسان کو سلام

راقم کو اس مقالے کی تیاری میں محترم ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا تعاون حاصل رہا، جس کے لیے وہ ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہے۔

ماٰخذ

(۱) مسلم سلیم، ہندو گو شعراء، کھوج خبر نیوز ڈاٹ کام Muslim salum.blogspot.in ۔ (۲) ''مسلمان لاہور'' کا غیر مسلم نعت گو شعراء نمبر، ج ۷، شمارہ ۸، ص ۳۱، ۳۲۔ (۳) ایضاً ص ۳۶۔ (۴) ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، اردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے، بہار آفسیٹ اکولہ (مہاراشٹر) ۱۹۹۵ء، ص ۵۴۔ (۵) علیم صبا نویدی، نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے، مطبوعہ تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چینائی۔۲، ۲۰۰۲ء، ص ۳۱۔ (۶) ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق، اردو میں نعتیہ شاعری، مطبوعہ کراچی (پاکستان)، ۱۹۷۶ء، ص ۲۷۵-۲۷۶۔ (۷) ''مسلمان لاہور''، ص ۴۲، ۴۷۔ (۸) ''اردو میں نعتیہ شاعری''، ص ۴۹۲-۴۹۳۔ (۹) ''مسلمان لاہور''، ص ۲۵-۲۶۔ (۱۰) ''اردو میں نعتیہ شاعری''، ص ۵۳۳ تا ۵۳۵۔ (۱۱) ''نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے''، ص ۴۹۔ (۱۲) نور احمد میرٹھی، ''بہر زماںؑ''، ادارۂ فکر نو، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۲۸۔ (۱۳) ''مسلمان لاہور''، ص ۴۷-۴۸۔ (۱۴) ایضاً ص ۳۸-۳۹۔ (۱۵) ''بہر زماںؑ''، ص ۲۴۳۔ (۱۶) ''مسلمان لاہور''، ص ۳۴-۳۵۔ (۱۷) ''بہر زماںؑ''، ص ۱۶۴۔ (۱۸) ایضاً ص ۲۶۴۔ (۱۹) ''اردو میں نعتیہ شاعری''، ص ۲۴۳، ۲۳۴۔ (۲۰) ''مسلمان لاہور''، ص ۳۳۔ (۲۱) ڈاکٹر مدنا منظر ''منظر بہ منظر''، انجمن ترقی اردو ہند (کرناٹک)، بنگلور، مطبوعہ ۱۹۸۲ء، ص ۱۷، ۲۵۔ (۲۲) چندر بھان خیال، ''لولاک''، فرید بک ڈپو دہلی، مطبوعہ ۲۰۰۲ء، ص ۴۴۔

جہان شبلی

ڈاکٹر شمس بدایونی

جہان شبلی کی قسط ہشتم پیش کی جارہی ہے۔یہ سلسلہ مولانا شبلی سے متعلق نوادرات، دستاویزات، تحریرات جو منتشر ہیں ان کو جمع کرنے اور ان سے متعلق تحقیقی تعارف پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔اسی سلسلے کے تحت مولانا شبلی کے دو دستیاب خط پیش کیے جارہے ہیں۔

ا۔ پہلا خط بابو سکھ دیال سنگھ شوق کے ناول ''مہا بھارت مکمل'' (مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۹۴ء) سے ماخوذ ہے۔شوق نے مہا بھارت کو بطرز ناول تین حصوں میں قلم بند کیا تھا حصہ اول ۱۸۹۱ء، حصہ دُوم وسوم ۱۸۹۳ء اور تینوں حصے یکجا ۱۸۹۴ء میں اسی پریس سے چھپ کر شائع اور مقبول ہوئے۔ ۱۸۹۳ء کا ایڈیشن مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اور ۱۸۹۴ء کا ایڈیشن راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔ایک ایڈیشن اسی پریس نے ۱۹۰۰ء میں بھی شائع کیا تھا، جس کا نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ ۱۸۹۴ء کے ایڈیشن کے شروع میں مولف نے کتاب اور صاحب کتاب سے متعلق انگریز آفیسروں اور اردو کے معروف مصنفوں کے تاثرات یا خطوط جمع کر دیے ہیں جو ماقبل کی اشاعتوں یا موجودہ اشاعت سے متعلق ہیں۔ان کی تعداد ہے۔یہ خطوط ۱۸ صفحات پر مشتمل ہیں، اردو کے حوالے سے مولانا شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کے خطوط اس کی زینت بنے ہیں۔

ناول کے مصنف سکھ دیال سنگھ شوق رئیس خورجہ بلند شہر، اپنے دور میں ناول نگار کی حیثیت سے متعارف تھے۔ ''دلربا'' کے نام سے ان کا ایک ناول شائع ہو کر ادبی حلقوں میں ان کی پہچان بنا چکا تھا۔ان کے ذاتی کوائف سے میں فوری طور پر مطلع نہیں ہوسکا، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ سنسکرت، اردو، فارسی اور انگریزی زبان سے بخوبی واقف تھے۔انہوں نے ناول کے لیے مواد تینوں زبانوں میں

۵۸، نیو آزاد پُرم کالونی، عزت نگر بریلی، ۲۴۳۱۲۲۔ موبائل نمبر: ۹۸۲۷۰۹۲۲۴۵

پائی جانے والی کتب وتراجم سے حاصل کیا ہے اور جگہ جگہ اس کے حوالے دیے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ناول میں رموزِ اوقاف کا خاص اہتمام کیا گیا ہے جو اس دور کے لحاظ سے اہم بات ہے۔ راقم الحروف نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر و اعتراف اپنے مقالے ''تجاویز سرسید اور تاریخ رموز اوقاف'' میں بھی کیا ہے۔ (مطبوعہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، سرسید نمبر، اکتوبر ۲۰۱۷ء ص: ۱۳۰ کالم ۲) مجھے ایسا لگتا ہے کہ مولانا شبلی کے خط میں ناول کی توصیف رسمی نہیں بلکہ واقعی ہے۔

خط کے آخر میں شبلی کا ''آپ کا دوست'' لکھنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ناول نگار سے مولانا شبلی کے پہلے سے مراسم قائم تھے۔ خط حسب ذیل ہے:

علی گڑھ، ۲۲ مارچ ۱۸۹۴ء

جناب من! دونوں حصے ناول کے پہنچے۔ میں آپ کو آپ کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے اس نئے طرز کو نہایت صاف اور لطیف کر دیا ہے، اب وہ قبول عام حاصل کر سکتا ہے۔ نہایت عمدہ بات یہ ہے کہ بخلاف اور ناولوں کے آپ کی کتاب، عشق کے بیہودہ جھگڑوں سے پاک ہے۔ یہ واقعی کمال کی بات ہے کہ آپ نے عشق کی چاشنی کے بغیر لٹریچر میں ایسی دلآویزی پیدا کی ہے۔ میں دل سے اس کتاب کی خوبی کا معترف ہوں۔ آپ کا دوست شبلی (مہابھارت مکمل، ص: ۹)

۲۔ خط نمبر ۲، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے آرگن ''اردو'' جلد ۹۰۔۸۹، شمارہ ۱۴، ۲۰۱۳ء سے ماخوذ ہے۔ یہ رسالہ ہندوستان میں بہت کم آتا ہے، اسی لیے ''معارف'' کے توسط سے اس خط کو وقف عام کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس مجلہ میں محمد حمزہ فاروقی کا ایک مضمون بعنوان ''مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط امین زبیری کے نام'' شائع ہوا ہے۔ اس میں انڈیا آفس لندن میں محفوظ ۳۵ خطوط کو حاصل کر کے مناسب تمہید اور وضاحتی حواشی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ جملہ خطوط امین زبیری کے فرزند محمد یامین زبیری نے انڈیا آفس لندن میں محفوظ کرادیے تھے۔ امین زبیری کے نام مولانا شبلی کے ۳۱ خطوط ''مکاتیب شبلی'' جلد اول، مرتبہ سید سلیمان ندوی (مطبع شاہی لکھنؤ، ۱۹۱۶ء) میں شامل ہیں۔ اس خط کے دستیاب ہو جانے کے بعد امین زبیری کے نام خطوط کی تعداد ۳۲ ہوگئی ہے۔ اس خط کو پڑھنے سے پیشتر یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ خط اس ہنگامی دور کا ہے جب ندوۃ العلماء لکھنؤ کے منتظمین نے

مولانا شبلی پر بہت سے اعتراضات قائم کیے تھے اور ان کی بنیاد پر مولانا شبلی اور ان کے ساتھیوں کو ندوہ سے بے دخل کر دیا تھا، اس کشمکش کی وجہ سے ریاست بھوپال اور رامپور نے ندوہ کے لیے اپنی ماہانہ و سالانہ امداد روک دی تھی۔ خط حسب ذیل ہے۔ مرتب خطوط نے اس خط پر جو حواشی دیے ہیں وہ خط کے مضمون کی بخوبی وضاحت کرتے ہیں، اس لیے ان کو بھی نقل کیا جا رہا ہے:

بمبئی، ۳۰؍جولائی ۱۹۱۴ء

مجی! مسودہ بعد تصحیح رجسٹرڈ بھیج چکا، کیا اب تک نہیں پہنچا؟

ندوہ (۱) کے متعلق ایک موٹی سی بات یہ ہے کہ اس قدر احتجاج اور قومی مطالبے کے بعد وہ لوگ کسی قومی ثالثی پر کیوں راضی نہیں ہوئے؟ اور صرف لکھنؤ کے چند اشخاص اس جابرانہ قبضے کے بعد کس حق سے بھوپال اور رامپور سے اجرائے وظیفہ کے خواستگار ہیں؟

سید سلیمان (۲) کو تاکید کی ہے۔ وہ کسی قدر مجبوریوں ہیں کہ پونا میں کوئی کتب خانہ نہیں، البتہ ایک دو مہینے میں جب وہاں تین مہینے کی تعطیل ہوگی تو ان کو کافی موقع ملے گا، وہی اس کام کو پورا کریں گے۔ میں ہر طرح مدد کروں گا۔

مسودہ سیرت (۳) کی نسبت، دیوبند تو سرے سے انکار کرتا ہے۔ میں نے عبداللہ صاحب ٹونکی کا نام بھی پیش کیا تھا، اگر ان کی نسبت رضامندی ہو تو وہاں بھیج دوں، گو بخدا مجھ کو یہ ذلت سخت گراں ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر مولوی محمود حسن صاحب باضابطہ انکار کریں تو سرکار کا فرض پورا ہو چکا۔ علماء اگر کتمان شہادت کریں تو روٗسا کا کیا قصور؟

شبلی (اردو، ص:۳۸)

مذکورہ بالا خط کی تاریخ ۳۰؍جولائی ہے۔ ۲۸؍جولائی اور ۲۹؍جولائی ۱۹۱۴ء کو بھی مولانا شبلی نے زبیری کو خطوط لکھے ہیں (گویا ہر دن ایک خط لکھا ہے) جو ''مکاتیب شبلی'' جلد اول میں شامل ہیں۔ مرتب خطوط محمد حمزہ فاروقی نے تمہید میں لکھا ہے:

''بھوپال میں قیام کے دوران آپ نے ۱۹۲۳ء میں عطیہ فیضی سے رابطہ کیا اور شبلی کے خطوط بنام عطیہ فیضی حاصل کیے، پھر ان کی اشاعت کی، پھر اسی پر اکتفا نہ کیا، مولانا شبلی کے خلاف معاندانہ مواد اپنے ساتھی محمد مہدی کو فراہم کیا، انہوں نے ۱۹۲۵ء میں ایک

کتابچہ تیار کیا''۔(ص ۳۷)

راقم الحروف، مولانا شبلی کے خلاف محمد مہدی کے لکھے کسی بھی کتابچے سے لاعلم ہے۔ ''کتابیات شبلی'' میں بھی ایسے کسی کتاب یا رسالے کا مذکور نہیں۔ ''خطوط شبلی'' کی جدید تدوین کے دوران مجھے اس طرح کا کوئی حوالہ نہیں مل سکا کہ ۱۹۲۵ء میں بھی امین زبیری شبلی مخالف سرگرمیوں میں ملوث تھے، بلکہ میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ جیسا کہ میں نے ''خطوط شبلی'' کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> ''ان خطوط کی ترتیب کے وقت تک مرتبین کی نیت شبلی کی کردارکشی اور بدنامی کی نہ تھی بلکہ ایک عبقری شخصیت کی زندگی کے ایک نئے، انوکھے اور کسی حد تک نامعلوم پہلو اور افکار شبلی پر اس کی نشاندہی تھی، جیسا کہ دونوں دیباچوں (خطوط شبلی، طبع اول و دوم) کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے''۔(خطوط شبلی مرتبہ شمس بدایونی ساہتیہ اکیڈمی دہلی، ۲۰۱۷ء ص:۴۵)

مجھے محمد حمزہ فاروقی کے بیان میں کسی قسم کی سچائی نہیں نظر آتی۔ واللہ اعلم

۳۔ جناب راجو خاں (بیگوسرائے، بہار) نے ازراہ علم دوستی اپنے نانا محمد یاسین خاں (ف ۲۰۰۶ء) کے علمی ذخیرے سے بچوں کے نصاب تعلیم کی ایک کتاب ''رہنمائے اردو'' حصۂ اول مرتبہ محمد لطیف اللہ خستہ انصاری (مطبوعہ رحمانی پریس پٹنہ، سنہ ندارد) کے بعض صفحات کے عکس مجھے فراہم کیے۔ ۲۲۳ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اس جذبے کے ساتھ قلم بند کی گئی تھی کہ صوبۂ بہار میں اردو کا جو نصاب تعلیم رائج ہے اس میں یہاں کے مصنفین کا مرتبہ نصاب تعلیم شامل نہیں۔ یہ کتاب دیباچہ کے علاوہ ۴۱ نثری تحریروں اور ۵۰، منظومات پر مشتمل ہے۔ ۱۲ نثری تحریریں مولف کتاب کی بھی شامل ہیں۔ انہی نثری تحریروں کے ضمن میں اکبرالہ آبادی، امداد امام اثر، مولوی محمد حبیب اللہ، مولانا شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ شبلی کا خط مکتوبہ ۲/ جولائی ۱۸۹۷ء بنام مولوی محمد سمیع اللہ، مکاتیب شبلی سے اخذ کر کے شامل کیا ہے۔ (ص: ۱۲۴) سید صاحب کا جو خط شامل کتاب ہے، وہ مولف کتاب کے نام ہے۔ خط کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولانا شبلی کے خط کے حصول کے لیے سید صاحب سے رابطہ قائم کیا گیا تھا۔ سید صاحب کے خط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زیر نظر کتاب کی ترتیب کے دوران یہ خط لکھا گیا۔ اس طور ۱۹۲۲ء کے بعد کے عرصہ میں یہ کتاب شائع ہوئی ہوگی۔ مولف کتاب نے اس کا حصۂ دوم بھی ترتیب دیا تھا۔ اس کے علاوہ مولف نے ملت محمدیہ،

صحیفۂ زندگی، حیات لقمان، آنکھیں، فغان مسلم، گلدستۂ لطیف، (مجموعۂ غزلیات) جذبات لطیف، سیرت الاعظم، عدل فاروقی (نظم)، عہد فاروقی کے نام سے متعدد کتابیں لکھیں اور سرسید و شبلی کی بنائی ہوئی شاہراہ پر چل کر قوم کی اصلاح کی کوشش کی۔ مولف کتاب نے تقسیم ہند کے دوران پاکستان کو ہجرت کی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ سید صاحب کا خط حسب ذیل ہے:

دفتر دارالمصنّفین اعظم گڑھ، شعبۂ معارف نمبر ۸۷۳،

مورخہ ۳؍فروری ۱۹۲۲ء

محترم السلام علیکم مکرمت نامہ مسرت افزا ہوا، حسن ظن کا شکریہ۔ آپ نے مقامہ یا مکانواں کی جغرافی و تاریخی توضیح کی بیکار زحمت اٹھائی۔ میرا مولد بھی آپ ہی کا صوبہ بلکہ ضلع ہے۔ مجھے خاک بہار کے فرزند ہونے کا شرف حاصل ہے، شاید آپ نہ جانتے ہوں؟

خاک بہار کی افسردگیوں پر میں نے آنسو بہائے ہیں، اور مایوس ہو کر اپنا مرکز علمی بدلنا پڑا۔ سنہ ۱۲ء (۱۹۱۲ء) میں میرا خیال تھا کہ پٹنہ سے ایک علمی رسالہ نکالوں، کئی مہینے سرگرداں رہا، آخر مولانا شبلی مرحوم نے اس خیال سے ہٹایا اور پونہ کالج بھیج دیا، لیکن میں تھا کہ ان بندشوں میں مجھے پھنسنا گوارا تھا؛ چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق سرکاری نوکری سے مستعفی ہو کر علم و فن کی آستانہ بوسی پر قناعت کر لی۔ مکاتیب شبلی کی دو جلدیں چھپ گئی ہیں اور وہ ہر جگہ ملتی ہیں، یہاں بھی فروخت ہوتی ہیں، ان سے آپ کو انتخاب لینا چاہیے۔ آپ کی تالیفات میں نے دیکھی نہیں، اس لیے اظہار خیال نہیں کر سکتا۔ مولوی فخر الدین، مولوی شفق، مولوی حبیب اللہ صاحب وغیرہ سے میری بھی ذاتی ملاقاتیں ہیں۔ والسلام سید سلیمان (رہنمائے اردو، ص:۱۲۵)

۴۔ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس (آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس) کا اجلاس چہارم منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، دسمبر ۱۸۸۹ء بہ مقام علی گڑھ کی روداد، سرسید کا لکچر اور متفرق تحریرات نظم و نثر مطبع مفید عام پریس آگرہ سے تین مختلف ناموں سے چھپ کر شائع ہوئی (۴) اسی سلسلے کے تحت روداد کے ساتھ ایک ضمیمہ بعنوان ''ضمیمہ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس'' شائع کیا گیا، جس میں اس اجلاس میں پڑھے جانے والے مضامین اور نظموں کو محفوظ کرنے کی سعی کی گئی تھی۔ اسی مجموعۂ نثر و نظم میں مولانا شبلی نعمانی کے

فارسی ترکیب بند کو بھی مع سرورق جگہ دی گئی ہے جو اس اجلاس میں پڑھا گیا۔ اس میں ۶۴ شعر ہیں۔ یہ صفحہ ۶۱ سے ۶۵ کو محیط ہے۔ سرورق یہ ہے: ترکیب بند/ مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ/ متعلق اجلاس چہارم محمڈن ایجوکیشنل کانگریس منعقدہ بہ مقام علی گڑھ/ مطبع مفید عام آگرہ میں طبع ہوا۔ یہ ترکیب بند کلیات شبلی فارسی میں من وعن شامل کرلیا گیا ہے۔ البتہ سنہ کا اندراج ۱۸۹۰ء کیا گیا ہے، صحیح سنہ ۱۸۸۹ء ہے۔

اس ترکیب بند کا پہلا اور آخری شعر حسب ذیل ہے:

حیرتم می برو اینک کہ بدیں زینت ساز چیست کیں بزم بآئین دگر بست طراز

داد را، ہان پسند اینکہ دریں کد باشیم ما کہ از حلقہ بگو شان محمد باشیم

کتابیات شبلی (اعظم گڑھ ۲۰۱۱ء) میں اس اشاعت کا ذکر نہیں۔ اس کے سرورق کا عکس پیش خدمت ہے۔

حواشی

(۱) ۱۹۱۴ء میں ندوۃ العلما کے منتظمین نے مولانا شبلی اور ان کے رفقا کو ندوہ سے بے دخل کر دیا تھا اور دونوں فریقوں میں تنازع عروج پر تھا۔ اس وقت ریاست بھوپال اور رامپور نے ندوۃ العلما کی امداد روک لی تھی اور حکومت ہند کے محکمۂ تعلیم نے بھی سخت اعتراضات کیے تھے۔ (محمد حمزہ فاروقی) (۲) سید سلیمان ندوی نے پونا میں پروفیسری کے زمانے میں ''ارض القرآن'' لکھی تھی۔ ابتدا میں اسے ''سیرۃ النبی'' کے مقدمے کے طور پر تحریر کیا گیا، لیکن بعد میں موضوع کی اہمیت اور وسعت کے پیش نظر اسے علاحدہ کتابی صورت دی گئی۔ سال ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ (۳) ''سیرۃ النبی'' کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' میں شائع کیا تو ''النجم'' کے مدیر مولوی عبدالشکور نے اس پر سخت تنقید کی۔ مخالفین، جن میں دیوبند کے کچھ علما بھی شامل تھے، اس تنقید کو لے اڑے اور اسے والیۂ بھوپال تک پہنچایا تاکہ والیۂ بھوپال ''سیرۃ النبی'' کی امداد روک لیں۔ والیہ نے حقیقت حال جاننے کے لیے مولانا شبلی سے رجوع کیا۔ سرکاری مراسلے کے جواب میں مولانا شبلی نے لکھا کہ ''کسی مستند عالم کو تجویز فرمائیں تاکہ مسودہ اس کے پاس بھیج دیا جائے''۔ شبلی نے شیخ الہند مولانا محمود حسن (صحیح: محمود الحسن) کا نام تجویز کیا، لیکن علماے دیوبند نے مولانا محمود حسن کو مسودے پر نظر ثانی سے باز رکھا۔ مولانا شبلی نے مفتی عبداللہ ٹونکی کا نام تحقیقِ مسودہ کے لیے تجویز کیا تھا۔ (محمد حمزہ فاروقی) (۴) محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا چوتھا سالانہ جلسہ، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۸۰ء، لکچر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے تاریخانہ حالات اور جدید واقعات، سرسید احمد خاں، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۸۰ء، ضمیمہ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۸۰ء۔

اخبار علمیہ

''انڈونیشیا کی ۱۲/زبانوں میں ترجمۂ قرآن مجید کی اشاعت''

۲۰۱۵ء میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق دنیا کے جملہ مسلمانوں کا ۱۲ فیصد حصہ انڈونیشیا میں آباد ہے۔ یہاں مقامی طور پر سات سو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ خبر ہے کہ انڈونیشیا کی وزارت برائے اسلامی امور کی جانب سے وہاں کی تین مقامی زبانوں میں ترجمہ قرآن کی اشاعت عمل میں لائی جا چکی ہے۔ اس طرح سال رواں میں جملہ ۱۲ مقامی زبانوں میں ترجمہ قرآن کی طباعت و اشاعت مکمل ہو چکی ہے۔ اس میں وزیر برائے اسلامی امور لقمان حکیم صفی الدین کا کہنا ہے کہ وزارت ملک کے دور دراز جزائر میں مقیم مسلمان اور غیر مسلموں تک قرآن مجید کا پیغام پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے بالخصوص وہ جزیرے جن کی اکثریت دین سے نابلد ہے، ان تک ان تراجم کو پہنچانا ضروری سمجھتی ہے۔ (صراط مستقیم، برمنگھم، جنوری ۲۰۱۸ء)

''کڈمائی کیفے''

اس نام سے بنکاک میں ایک ایسا ہوٹل تعمیر کیا گیا ہے جہاں جانے کے بعد انسان کو ہمہ وقت موت یاد آتی ہے۔ اس میں مصنوعی انسانی ڈھانچوں اور تابوت کے ساتھ ساتھ ایسی تختیاں نصب کی گئی ہیں جو موت، بیماری، بڑھاپا اور تکلیف وغیرہ کو اجاگر کرتی ہیں۔ یہاں آنے والوں کے لیے ایسا ماحول پیش کیا جاتا ہے جس میں پہنچ کر وہ خود کو موت سے قریب تر محسوس کرتا ہے اور تابوت میں لیٹنے کے بعد تو مرنے کے بعد کی حالت کا اندازہ بھی کر سکتا ہے۔ علامتی تختی پر لکھی عبارت کا یہ مفہوم کہ ''آپ اس دنیا سے خالی ہاتھ جائیں گے''۔ خاص طور پر دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ وصیت تحریر کرنے کے لیے کاغذ اور قلم کی سہولت بھی فراہم کی جاتی ہے۔ (انقلاب، وارانسی ایڈیشن، ۲۵/۳/۱۸ء، ص ۸)

''اسٹیفن ہاکنگ کی آخری تحقیق''

دنیائے سائنس کی ممتاز ترین شخصیت اسٹیفن ہاکنگ کا تعلق برطانیہ سے تھا، پچھلے دنوں ان کا انتقال ہوا، لیکن اپنے سائنسی نظریات و افکار کے سبب دنیا والوں کے درمیان وہ یقیناً دیر تک زندہ رہیں گے۔ کائنات کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کرتے کرتے ان کی شخصیت خود پُراسرار بن گئی تھی۔ معلوم ہوا

کہ وفات سے ۱۰ روز قبل انہوں نے "A Smooth Exit From Eternal Inflation" کے عنوان سے اپنی آخری تحقیق سائنس کے ایک موقر جریدہ (جس کا نام رپورٹ میں نہیں دیا گیا ہے) اشاعت کے لیے بھجوایا تھا۔ رپورٹ میں یہ بھی درج ہے کہ سال گذشتہ ۲۴؍جولائی کو ''آرکائیوڈاٹ آرگ'' نامی پری پرنٹ ویب سائٹ پر اس کو شائع کرا چکے تھے۔ پھر اسی مقالہ میں خاصی ترمیم کی اور ۴؍مارچ ۲۰۱۸ء کو اسی ویب سائٹ پر اسی مقالہ کو اپ لوڈ کیا گیا۔ مقالہ کے شریک مصنف تھامس ہرٹوگ کے بیان کے مطابق اس مقالہ میں کثیر کائناتوں کی ممکنہ دریافت کے عملی طریقوں پر بات کی گئی ہے، ان کا کہنا ہے کہ اکثر سائنس دانوں کے نزدیک کثیر کائناتوں کا تصور موجود ہے اور انہیں اس پر یقین ہے لیکن چونکہ اب تک دوسری کائناتوں کے سراغ لگانے کا کوئی ایسا طریقہ دریافت نہیں کیا جاسکا جس سے ان کا حتمی وجود ثابت ہو سکے اسی لیے ان کائناتوں کا تصور اب تک مفروضہ ہی ہے۔ آنجہانی سائنس داں نے اپنے آخری تحقیقی مقالہ میں اسی پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے نہ صرف اس تصور کی بھرپور حمایت کی ہے بلکہ پیشین گوئی بھی کی تھی کہ اگر ہم کائناتی خورد موجی پس منظر (کاسمک مائیکرو ویو بیک گراؤنڈ) کا انتہائی باریک بینی سے مشاہدہ کرنے کے قابل ہو جائیں تو ہمیں دوسری کائناتوں کے وجود کا ثبوت یقیناً مل جائے گا۔ سائنس دانوں کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ اسٹیفن کی پیشین گوئی ایک پیچیدہ حسابی عمل کے سوا کچھ نہیں ہے اور اسٹیفن کی شہرت کے باعث عالمی ذرائع ابلاغ میں یہ معاملہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جارہا ہے۔ اسی طرح کثیر کائناتی تصور بھی ان کے نزدیک محض تسلی کے لیے گھڑا گیا ہے۔

(انقلاب، ورانسی ایڈیشن، ۱۸/۳/۲۵ء میں اس کی تفصیل ملاحظہ ہو)

''انسانی مزاج معلوم کرنے کا اہم ذریعہ''

یونیورسٹی آف برسٹل کے ماہرین نے ۲۴ گھنٹے تک ۸۰ کرور سے زائد ٹوئیٹر پیغامات کا جائزہ لیا اور مختلف موسموں میں بھی پیغامات جمع کیے ہیں، بعد ازاں اس کو ڈیٹا لرننگ مشین سے گزارا گیا۔ اس کے بعد ماہرین نے بتایا کہ سوشل میڈیا فیس بک، ٹوئیٹر اور دیگر پلیٹ فارم انسانی مزاج کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ڈیٹا کی مشین لرننگ اور تجزیہ کا کام ڈاکٹر فبیین زوگینگ، مرکزی تحقیق ڈاکٹر اسٹیفر ڈلائن مین اور مصنوعی ذہانت کا سارا کام یونیورسٹی کے شعبۂ انجینئرنگ میتھ میٹکس نے کیا۔ اس کے لیے ماہرین نے

جسمانی گھڑی کا جائزہ لیا جو دن اور رات کے لحاظ سے بدن کے معمولات پر کنٹرول کرتی اور انسانی مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ۸۰ کروڑ ٹوئٹس چار سال میں جمع کیے گئے۔ ان میں خوشی، شادی، حیرت انگیز، مبارک باد، ایسٹر اور کرسمس وغیرہ کے الفاظ نظر انداز کر دیے گئے تھے تا کہ ڈیٹا پر اثر نہ پڑے۔ اس کے بعد منفی اور مثبت الفاظ والے ٹوئٹس کی فہرست بنائی گئی جو ۲۴ گھنٹے کے موڈ کو ظاہر کرتی ہے۔ صبح کے وقت غصہ سب سے کم لیکن شام تک موڈ خراب ہوتے ہوتے غصہ اپنے عروج پر دکھائی دیا۔ اسی طرح اداسی ۶ بجے صبح کم مگر ۸ بجے عروج پر، اسی طرح تعب و تھکن ۸ بجے صبح عروج پر مگر اس کے بعد دن میں درجہ بدرجہ کم دیکھی گئی۔ بدلتے موسموں کا ٹوئٹس میں غصے اور تھکن پر کوئی اثر نہیں ہوتا جبکہ بدلتے موسموں نے مزاج اور اداسی پر اثر ڈالا۔ اپنی تجزیاتی رپورٹ میں ماہرین نے کہا ہے کہ دن کے مختلف اوقات منفی اور مثبت مزاج پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ لیکن موسمیاتی تغیر مزاج اور تھکن پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے سوشل میڈیا انسانی مزاج کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے اور اس کی بدولت انسانی حیاتی گھڑی کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ تحقیق ”برین اینڈ نیورو سائنس ایڈوانسز“ رسالہ میں شائع ہوئی ہے۔ (بحوالہ اردو سائنس، نئی دہلی، مارچ ۲۰۱۸ء)

”ہندوستانی اشاراتی زبان کی پہلی لغت“

سال ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں پچاس لاکھ ۷۱ ہزار سے زائد سماعت سے اور انیس لاکھ ۹۸ ہزار سے زائد نطق سے معذور افراد ہیں۔ سماجی انصاف اور تفویض اختیارات کی وزارت کے تحت محکمے آئی ایس ایل آر اینڈ ٹی سی نے تین ہزار الفاظ پر مشتمل ہندوستانی اشاراتی زبان کی پہلی لغت تیار کی ہے۔ جس کا اجرا دہلی میں مرکزی وزیر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس کا بنیادی مقصد گونگے اور بہروں کے درمیان مواصلاتی رکاوٹوں کو دور کرنا، اظہار رائے کی آزادی کے حقوق فراہم کرنا اور انہیں سماج کے اصل دھارے میں شامل کرنا ہے۔ یہ لغت مختلف زمروں کے الفاظ جیسے قانونی، طبی، تعلیمی، تکنیکی اور روزمرہ استعمال کیے جانے والے الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کو تیار کرنے میں ڈیڑھ برس کا عرصہ صرف ہوا ہے۔ جلد ہی اس میں نئے الفاظ شامل کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کریں گے۔ (اخبار مشرق، نئی دہلی، ۲۴/مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۵)

ک، ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر اور نئے رسالے

دبستان نعت (ششماہی): مدیر ڈاکٹر سراج احمد قادری، شمارہ اول و دوم، صفحات بالترتیب ۴۰۰ اور ۷۶۷، قیمت ۲۰۰/اور ۵۰۰/روپے، پتہ: نعت ریسرچ سنٹر انڈیا، محلہ بنجاریا ویسٹ، خلیل آباد، ضلع سنت کبیر نگر یوپی ۲۷۲۱۷۵۔

اردو کے کم ہی رسالے ہوں گے جن کے صفحات نعتیہ شاعری سے محروم ہوں گے، وجہ ایک یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اکثر شعراء اپنے خیالات میں روشنی کے امتزاج کی ضرورت اور اس کی اہمیت کے قائل ہیں اور اس کے لیے فن اور نمود فن میں تصور اسی پاک ذات کا ضروری ہے جس سے روشنی اور نور عبارت ہے، زیر نظر دو ضخیم شمارے اسی روشنی کی تلاش کا مبارک حصہ ہیں، مقصد میں ایک انوکھا پن یہ بھی ہے کہ حمد و نعت کے فروغ و ارتقا میں ان شعراء کی کاوشوں کو بطور خاص پیش کیا اور روشناس کرایا جائے، جن کو ناقدین ادب کی توجہ نہیں مل سکی، مظفر وارثی، طاہر سلطانی، رؤف امروہوی، اعجاز کا میٹھوی، فروغ اعظمی اور نوشاد کریمی جیسے شعرائے نعت پر عمدہ مضامین اسی کوشش کا نتیجہ ہیں، پہلے شمارہ میں اچھے مقالات بھی ہیں، ایک گوشہ مولانا جامیؔ کے نام ہے، نعتیں ہیں اور ان کے شعراء کے متعلق کہا گیا کہ یہ، لوگوں کے ذہن سے محو ہوتے جارہے ہیں، یہ زیادہ صحیح نہیں، حمید صدیقی، ابوالخیر کشفی، اجمل سلطان پوری، چندر بھان خیال، علیم صبا نویدی، رباب رشیدی، تابش مہدی وغیرہ شعراء ان میں نہیں جن کو فراموش کیا جاسکے، اداریہ میں کہا گیا کہ ''میلاد اکبر میں اگرچہ کچھ موضوع روایتیں ہیں مگر حدیث کے کلیہ کے مطابق فضائل ومناقب میں موضوع روایات کا بھی اعتبار ہے''۔ کاش اس کلیہ پر غور کرلیا گیا ہوتا۔

دوسرے شمارہ میں یہ خواہش پوری ہوئی، فاضل مدیر نے لکھا کہ مذکورہ جملہ کی پشیمانی میری روح پر سایہ کی طرح چھائی رہی، اسی طرح ایک تحریر میں کہا گیا کہ اردو نعت نگاری کی تاریخ، جائسی کی پدماوت سے ملتی ہے۔ اور یہ بھی کہ فارم کے اعتبار سے اردو نعت گوئی کو 'صنف سخن' نہیں کہا جاتا لیکن

دوسرے شمارے میں کہا گیا کہ ''نعت کو دیگر اصناف کے تقابل و تناظر میں نہیں دیکھا جانا چاہیے کہ مثنوی اور مرثیہ اگر ادب کی صنف ہیں تو نعت کیوں نہیں؟ یہ ظاہر کرتا ہے کہ شمارہ اول کو بغور پڑھا گیا، دوسرا حصہ پہلے سے کہیں زیادہ ضخیم ہے اور اس میں حصہ نثر غالب ہے، تابش فکر و نظر، افکار روشن، گوشہ حسان الھند، زاویہ نگاہ اور تعارف و تبصرہ عنوانوں کے تحت نعت گوئی کے فن، لفظیات، تنقید اور شعری جمالیات جیسے موضوعات پر عمدہ مضامین آ گئے ہیں۔ مجموعی لحاظ سے یہ کوشش کامیاب ہے کہ قاری کی فکر و نظر کے لیے نعتیہ ادب کا معطر تحفہ پیش کیا جائے، تحمید و تقدیس اور ثنا و نعت کی غایت اس کے سوا اور کیا ہے کہ

نیرنگیوں سے یار کی حیراں نہ ہوجیو　　ہر رنگ میں اسی کو نمودار دیکھنا

سہ ماہی اردو ادب ''اختر الایمان نمبر'': مدیر اعلیٰ صدیق الرحمٰن قدوائی، مدیر اطہر فاروقی، معاون مدیر سرور الہدیٰ، شمارہ ۷-۲۳۶، جلد ۶۰-۵۹، صفحات ۶۰۶، قیمت ۳۰۰روپے، سالانہ ۳۰۰روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایوینیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

گذشتہ صدی کے عین نصف میں اردو شاعری نے کثرت سے نئے لہجے اور نئے اسلوب دیکھے اور سنے، آہنگ میں جدت تھی جسے روایت سے بغاوت بھی تعبیر کیا گیا، تاہم وقت کے یہ راگ بھی پرانے ہوئے اور بعض وقت کی لہروں کے ذریعہ کنارے اور ٹھکانے لگ گئے، لیکن جہاں فکر و خیالات کی توانائی تھی وہ آج بھی زندہ ہیں، اختر الایمان کی شاعری بھی ایسی ہوئی کہ نقادوں نے ان کے مزاج سے ان کی شاعری کو پرکھا، بتایا گیا کہ اختر کے مزاج میں کچھ بے نیازی تھی تو اس سے زیادہ خود اعتمادی بھی، ان دونوں اوصاف نے ان کی شاعری کو اس لائق بنایا کہ سنجیدگی سے دیکھا، پڑھا جائے اور اس سے زیادہ سنجیدگی سے اس کا جائزہ لے کر دوسرے نامور معاصر شعراء سے اس کا محاکمہ بھی کیا جائے۔ زیر نظر شمارہ شاید اسی محاکمہ کی کوشش ہے جس کو اعلیٰ درجہ دیا جانا غلط نہیں، مضامین کی کثرت ہے، اس میں اسلوب انصاری سے ثاقب فریدی تک نئے اور پرانے قریب تمام معروف نقاد شامل ہیں، موضوعات کا تنوع ظاہر ہے، اس لیے نوعیتوں کی تعبیرات بھی اس کثرت سے ہیں کہ قاری خود کو وہاں پاتا ہے جہاں صرف حیرت کی فراوانی ہے۔ زیر نظر خصوصی شمارہ اردو کی شعری تنقید کی بوقلمونی کی دید اور اس کے حظ و

لطف کے لیے واقعی پڑھنے کے لائق ہے۔

تہذیب الاخلاق، خصوصی پیش کش یعنی سرسید نمبر: مدیر پروفیسر صغیر افراہیم، شمارہ ۱۰، جلد ۳۶، صفحات ۳۶۸، زرسالانہ ۱۵۰/روپے، خصوصی شمارہ ۸۰/روپے، پتہ: تہذیب الاخلاق، ڈی ۷، شبلی روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

سرسید دوسو سال پہلے پیدا ہوئے لیکن ان کی موثر، مفید، مثالی زندگی کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ جاری رہا۔ دوسو سالہ یوم پیدائش کی تقریبات نے اس ذکر کو اور رفعت بخشی، وجہ شاید حالات کے وہ تقاضے ہیں جن سے سرسید اپنی زندگی میں آشنا ہوئے اوران کو پورا کرنے میں انہوں نے جس حکمت وتدبر سے کام لیا، ان کی ضرورت آج، ان کے دور سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے، یہ شمارہ اسی ضرورت کی آواز بن کر سامنے آیا اور اس یقین سے آیا کہ سرسید انتہائی پرآشوب دور میں مطلع ہند پر عہد ساز بن کر نمودار ہوئے اور ہر نظریہ اور رجحان پر چھا گئے، اداریہ میں کہا گیا کہ ''سرسید تحریک کی افادیت اور عصر حاضر میں اس کی معنویت کو کارگر بنانے کے لیے سیدی مشن کی جانب سخت محنت درکار ہے''۔ شمارہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہے، بیسیوں مضامین ہیں اور یہ سب کے سب سرسید کے کسی نہ کسی گوشۂ زندگی کو اس طرح روشن کرتے ہیں کہ سرسید اوران کا مقصد زندگی واضح ہوکر رہتا ہے، شخصیات کا تقابلی مطالعہ، نظریہ دین ودنیا، متکلمانہ حیثیت، قومی ترقی، تعلیم نسواں، کمزور طبقات، تعلیمی مشن، تصورامن، اردو زبان وادب، لبرل، سیکولر اور سائنسی طرز فکر، علمی کارنامے جیسے موضوعات پر فکرانگیز اور نتیجہ خیز مباحث نے اس خصوصی پیش کش کو واقعی خاص بنادیا، اس کے لیے فاضل مدیر اوران کے شریک کار قابل مبارکباد ہیں۔

ماہنامہ ضیاء وجیہ ''ٹیپو سلطان شہید نمبر'': مدیر ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی، شمارہ ۵-۴، جلد ۲۸، صفحات ۲۱۲، قیمت سالانہ ۳۰۰/روپے، فی شمارہ ۳۰/روپے، پتہ: ماہنامہ ضیاء وجیہ، جامع العلوم فرقانیہ، بازار مسٹن گنج، رامپور یوپی ۲۴۴۹۰۱۔

ٹیپو سلطان شہید کا نام سنتے ہی ذہن ان جذبات پر آمین کہنے لگتا ہے کہ وہ شہیدان محبت کے امام اور آبروئے ہند وچین وروم وشام تھے۔ وہ جن کا نام آفتاب وماہتاب سے بھی تابندہ تر ہے اور

یہ کہ ان کی قبر کی خاک من وتو سے بھی زندہ تر ہے۔ ٹیپو سلطان ہندوستان کی تاریخ کا سب سے حوصلہ مند اور حوصلہ افزا باب ہے، فاضل مدیر نے وقت کے تقاضوں پر نظر کی تو یہ جانا کہ تاریخ کی کتابوں کو ازسرِنو صحیح اور سچے طریقہ سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے ورنہ جو عالم آج ہے، مستقل میں اس کے زیر زبر ہونے میں شبہہ نہیں، اسی احساس اور درد نے ان سے ٹیپو سلطان کی بے مثل زندگی کی تابناک کرنوں کو سمیٹنے پر آمادہ کیا اور اس خاص شمارہ کی شکل میں ملک وملت کے سامنے وقت کے بہترین تحفہ کی شکل میں پیش کرنے کی توفیق عطا کردی، انہوں نے بڑے سلیقہ سے کئی ابواب قائم کیے مثلاً مشاہیر کی نظر میں، خاندانی اور شخصی کمالات، انگریز سامراج سے نفرت، مذہبی رواداری، فنون حرب اور جنگی حکمت عملی، علوم وفنون کی سرپرستی، مکاتیب، عظیم شخصیات سے تقابل، عصر حاضر کی تصانیف میں ٹیپو، سفرناموں میں ٹیپو اور منظوم خراج عقیدت، ان عنوانات ہی سے ظاہر ہے کہ یہ شمارہ کس درجہ خاص ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سفر سرنگا ٹیم کی روداد ۱۹۱۸ء میں لکھا تھا کہ ''ہندو قوم جب جوان ہوگی تو مسلمان سلاطین کی نسبت اپنے طفلانہ خیالات پر اس کو خود ہنسی آئے گی، کیا اس کی جوانی کا وقت آپہنچا؟'' ۔ٹھیک سو سال بعد آج بھی یہی سوال منتظر جواب ہے کہ کیا اس قوم کے جوان ہونے کا وقت اب تک نہ آیا؟ بجا طور پر یہ قیمتی دستاویز نئی نسل کے مطالعہ میں ضرور آنی چاہیے۔

مجلہ تحقیقات عربی وفارسی: رئیس التحریر پروفیسر عبدالقادر جعفری، نائبہ صالحہ رشید، مدیر التحریر محمود حافظ عبدالرب مرزا، صفحات ۳۰۲، قیمت ۲۰۰/روپے، سالانہ ۳۰۰/روپے، پتہ: شعبہ عربی وفارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد یوپی ۲۱۱۰۰۲۔

الہ آباد یونیورسٹی کبھی مشرق کا آکسفورڈ کہلاتی تھی، اب خدا جانے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ کچھ چنگاریاں اب بھی ہیں جو کبھی روشنی اور کبھی حرارت کا احساس دلا جاتی ہیں، اس لحاظ سے اس کا شعبہ عربی و فارسی ہمیشہ نیک نام رہا، مولوی ذکاء اللہ سے پروفیسر عبدالقادر جعفری بلکہ صالحہ رشید اور نوخیز محمود حافظ مرزا تک کیسے کیسے نام اس سلک کو سلک گہر آبدار بناتے رہے، مولانا فراہی، پروفیسر عبدالستار صدیقی، پروفیسر زبید احمد، پروفیسر سید محمد رفیق، مولانا اجتباء ندوی وغیرہ ایک کہکشاں ہے ستاروں سے سجی، خوشی ہوئی کہ شعبہ نے اپنی اعلیٰ روایات کی پاسبانی کرتے ہوئے یہ عدد خاص تیار کیا، عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے مضامین سے آراستہ اکثر مضامین شخصیات کے تعلق سے ہیں، کچھ بڑوں کے قلم سے اور کچھ ان کے

قلم سے جو کل بڑوں میں شمار ہوں گے اور یہ ساری تحریریں اس لیے کہ اسلاف فراموشی کا داغ کہیں دامن پر نہ آجائے۔اس جذبہ کی قدر کرنا چاہیے اور اس عدد خاص کی بھی جس نے جذبوں کو زباں بخشی۔

سہ ماہی طنز و مزاح: مدیر اعلیٰ جناب ریاض احمد، مدیر خلیل احمد، شمارہ ۴، جلد ۴، صفحات ۱۱۲، قیمت ۶۰/روپے، پتہ: ۵۵۹، کے سی لے آؤٹ، لنگا راج پورم، بنگلور، ۵۶۰۰۸۴۔

رسالہ کی پیشانی پر مختصر اشارہ اس جملہ سے ہے کہ "ظریفانہ رنگ کا اظہاریہ" زندہ دلی کبھی لاہور اور لکھنؤ کے لیے خاص تھی، بھوپال سے ہوتے ہوئے یہ حیدرآباد سے منسوب ہوئی، اب بنگلور بھی زندہ دلان ادب کی فہرست میں آگیا، اردو کا یہ جادو بھی عجیب ہے کہ بظاہر ایک کنڑ علاقہ میں وہ دل زندہ کی تعبیر کا نشان ہے، اس رسالہ میں طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں ہیں اور خوب ہیں، اخوان لامتحدہ اور الف بے کی تختی جیسے مضامین شگفتہ ہیں اور شائستہ بھی۔طنز و مزاح کی کامیابی بھی اسی سے ہے۔

بچوں کا پھول: مدیر اعلیٰ ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی، مدیر عبداللہ دامدا ابوندوی، شمارہ ا، جلد ا، صفحات ۴۸، قیمت ۳۵/روپے، سالانہ ۳۵۰/روپے، پتہ: نیر رابطہ سوسائٹی، شمس الدین روڈ، نوائط کالونی، بھٹکل (کرناٹک) ۵۸۱۳۲۰۔

ایک زمانہ تھا، بچوں کے لیے کھلونا، کلیاں، غنچہ، نور جیسے رسالے اردو گھروں کی زینت تھے۔ بچوں کی زبان، ذہن، نفسیات کے یہ گویا نباض تھے، اب صرف چند رسالے ہیں اور وہ بھی محدود دائرہ میں۔ایسے میں بھٹکل سے زیر نظر رسالہ کو دیکھ کر مسرت ہوئی کہ عرصہ بعد بچوں کا ایسا رسالہ سامنے آیا جو مذہب، ادب، تاریخ، نظم اور معلومات کی ایسی دنیا ہے جو بچوں کے لیے قابل کشش ہے۔کشش، معنوی ہونے کے ساتھ ظاہری بھی خوب ہے، عمدہ، اعلیٰ درجہ کا کاغذ، رنگین طباعت اور بہترین ترتیب و پیش کش، یقین ہے کہ یہ بچوں کو پسند آئے گا اور یہ ان کی اخلاقی و ذہنی ترقی میں مددگار بھی ہوگا۔بھٹکل اب اردو کی زمیں ہے، اردو سے تعلق، شیفتگی بلکہ عشق کے مظاہر وہاں اور بھی ہیں۔یہ رسالہ ان میں دلکش اضافہ ہے۔

ع۔ص

معارف کی ڈاک

ترجمان القرآن کی تیسری جلد

حبیب منزل، میرس روڈ
علی گڑھ

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہنامہ معارف کے فروری ۲۰۱۸ء کے شمارہ میں مقالات ریاض شروانی کے تبصرہ میں درج ہے:

''شروانی صاحب کو اصرار ہے کہ ترجمان القرآن کی تیسری جلد مکمل تھی۔ اس کا مسودہ اگر غائب از نظر ہوا تو یہ اسی کی نگاہ کرشمہ ساز کا اثر ہے۔ کاش اس ''کسی'' کی پردہ دری بھی ہو سکتی''۔ اس سلسلہ میں عرض ہے نظر دو طرف جاتی تھی، محمد اجمل خاں صاحب اور مولانا آزاد کے سسرالی رشتہ دار۔ جب یہ مسئلہ مولانا غلام رسول مہر کے سامنے آیا تو انھوں نے اجمل خاں صاحب کی طرف بدگمانی کو مسترد کر دیا۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ اجمل خاں صاحب بہت شریف النفس آدمی تھے۔ لہٰذا وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتے تھے۔

اب بلاشبہہ مولانا آزاد کے سسرالی رشتہ دار اس دینی اور علمی خسارہ کے ذمہ دار رہ جاتے ہیں اور اس کا سبب ان کی جہالت، لالچ اور کم عقلی ہے۔

نیاز مند
ریاض الرحمٰن شروانی

سید صاحب کے فارسی خط کا مکتوب الیہ

ریاض
۱۳/ مارچ ۲۰۱۸ء

مکرمی مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ پہلے دو شکایتیں ایک ذاتی، دوسری معارف کے باب میں:

۱۔ گذشتہ شمارے میں میرا جو خط چھپا ہے اس میں آپ نے دو جگہوں پر ایسی ترمیم کر دی کہ

میں اب تک شرمسار ہوں۔ میں نے لکھا تھا:

"معارف کے فاضل مرتب برادرم مولانا عمیر الصدیق دریابادی حافظ قرآن ہیں اور ماشاءاللہ ان کا حفظ بہت پختہ ہے، کاش انہوں نے اس غلطی پر توجہ دی ہوتی"۔

مگر آپ کی منکسر المزاجی نے میری اس عبارت کو اس طرح بدل دیا:

"معارف کے حافظ قرآن مرتب نے کاش اس غلطی پر توجہ دی ہوتی"۔

برادرم! یہ جملہ آپ کی زبان سے ادا ہوتا تو مضائقہ نہ تھا، لیکن آپ نے میرے منہ میں اپنی زبان کیوں رکھ دی!

دوسری ترمیم آپ نے یہ کی کہ خط کے آخر میں میرے نام کے ساتھ لفظ "مولانا" کا اضافہ کر دیا، گویا میں نے بقلم خود اپنے کو مولانا لکھا ہے۔ اول تو خط جب اپنی اصل صورت میں چھپ رہا ہو تو نام بھی اسی طرح چھپنا چاہیے جس طرح مراسلہ نگار نے لکھا ہے، لیکن اگر کسی وجہ سے لقب کا اضافہ ناگزیر ہو تو معارف کی سابقہ روش کے مطابق اسے قوسین میں درج کرنا چاہیے۔

۲۔ گذشتہ مراسلے میں حیاۃ الحیوان پر مضمون کے بارے میں توجہ دلائی تھی کہ اس کا ایک حصہ بلا حوالہ ہے بعد میں اتفاقاً اسی شمارے میں ایک اور مضمون "اسلام میں آزادی فکر و عمل" کے عنوان سے دیکھا تو اس میں حوالے کچھ اور ہی بے حال تھے۔ مضمون کے آخر میں چند کتابوں کے نام ہیں اور بس۔ اڈیشن تو کیا جلد اور صفحے تک کا ذکر نہیں۔ بعض کتابوں کے بارے میں یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ ان سے مضمون میں کہاں استفادہ کیا گیا ہے۔ اگر کوئی مضمون فی نفسہ اچھا ہو اور اس میں اس طرح کی بے قاعدگی پائی جائے تو اشاعت سے قبل مضمون نگار سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسے دور کرے۔ اس دور میں رابطے کی جو سہولتیں میسر ہیں ان کے پیش نظر یہ کام چند دنوں میں ہو سکتا ہے۔ ماخذ اور حوالوں کا اہتمام کسی مضمون کے معیاری ہونے کی شہادت نہیں ہے، لیکن کسی علمی مضمون کے لیے بنیادی شرط ضرور ہے۔

۳۔ مارچ کے شمارے میں آثار علمیہ کے تحت مولوی طلحہ نعمت ندوی صاحب نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ایک نادر فارسی خط شائع کیا ہے۔ تمہید میں انہوں نے لکھا ہے کہ سید صاحب کی مراسلت فارسی کے ممتاز افغانی ادبا و شعرا سے تھی جن میں مشہور افغانی شاعر سرور خاں گویا کا نام سید صاحب کے

مکاتیب میں کئی جگہ ملتا ہے۔لیکن اس خط کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس کے مکتوب الیہ کا یقینی فیصلہ تو مشکل ہے،البتہ مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ پروفیسر براؤن کو لکھا گیا ہے۔

غالباً ڈاکٹر محمد حمیداللہ صاحب کے ذکر سے فاضل مضمون نگار کا ذہن یورپ کی طرف منتقل ہوا اور سید صاحب کی کتاب ''خیام'' کے ذکر سے انہیں براؤن کا خیال آیا۔ورنہ خط کے مندرجات میں کوئی اور ایسا قرینہ پایا نہیں جاتا جس سے ان کے اس قیاس کی تائید ہوتی ہو۔اور جیسا کہ آگے آئے گا، یہ خط جب لکھا گیا ہے اس سے دس سال قبل ۱۹۲۶ء میں براؤن کا انتقال ہو چکا تھا۔

سید صاحب کے اس خط کے مکتوب الیہ وہی سرور خاں گویا اعتمادی ہیں جن کا ذکر ابھی گزرا ہے،اور اس کی دلیل خاص طور سے خط کی یہ سطریں ہیں:

''نامہاے (نامہ ہاے) حکیم سنائی کہ بدریافت آنہا شما موفق شدہ اید،

اہمیتِ بزرگ دارد۔بر جہانِ فارسی منتِ بے اندازہ کردید''۔

اس عبارت میں نامہ ہاے سنائی کی جس دریافت کا ذکر ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ سرور خاں گویا کو ایک قلمی نسخہ ملا تھا جو حکیم سنائی کے بعض دوسرے آثار کے ساتھ ان کے مکاتیب پر بھی مشتمل تھا۔اسی نسخے کی بنیاد پر انہوں نے یہ مکاتیب سنہ ۱۳۲۱ اور ۱۳۲۲ خورشیدی میں مجلہ آریانا کابل کے ابتدائی شماروں میں شائع کیے تھے۔مکاتیب سنائی کی اشاعت کی یہ اولین کوشش تھی۔

سید صاحب نے خط کے آخر میں یہ وعدہ کیا ہے کہ مکتوب الیہ کا ذکر جمیل معارف میں آئے گا۔چنانچہ ستمبر ۱۹۳۶ء کے شذرات میں سید صاحب رقم طراز ہیں:

''ادیب فاضل سرور خاں گویا کے خط سے یہ معلوم کرکے بے حد خوشی

ہوئی کہ انہوں نے حکیم سنائی کے کلام کا ایک نہایت قدیم و نادر مجموعہ دریافت کیا ہے

جس کی کتابت حکیم سنائی کی وفات کے پچاس برس بعد ہوئی ہے''۔

اس کے بعد سید صاحب نے ان منظومات کا ذکر کیا ہے جو اس مجموعے میں شامل تھیں۔ لیکن تعجب ہے اس موقع پر انہوں نے مکاتیب کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا۔

سید صاحب کے مکتوب گرامی میں مکتوب الیہ کے پیغام کا بھی ذکر ہے جو ڈاکٹر محمد حمیداللہ صاحب کے ذریعے انہوں نے سید صاحب کو بھیجا تھا۔ڈاکٹر صاحب افغانستان کے سفر سے جون

۱۹۳۶ء میں واپس آئے تھے جیسا کہ ستمبر کے انھی شذرات کے آغاز میں سید صاحب نے ذکر کیا ہے۔ سید صاحب نے سرور خاں گویا کے خط کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے جس میں گویا صاحب نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے علم اور حسن اخلاق کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ سید صاحب کے مکتوب میں ''پیغام'' سے مراد گویا صاحب کا یہ خط بھی ہوسکتا ہے اور زبانی پیغام بھی۔ توقع یہ ہے کہ گویا صاحب کا خط دارالمصنّفین میں محفوظ ہوگا، اس موقع پر کیوں نہ اسے شائع کر دیا جائے۔*

سید صاحب کے خط میں مکتوب الیہ کے سفر ایران کا ذکر بھی ہے کہ وہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے سید صاحب کے نام جو خط لکھا تھا وہ موصول نہیں ہوا، شذرات میں اس سفر کا تذکرہ بھی ملاحظہ ہو:

> ''ہمارے دوست اس مجموعے کو جشن فردوسی کے موقع پر ایران لے گئے تھے۔ وہاں کے فضلا اس کو دیکھ کر بے حد محظوظ ہوئے۔ اس کا کوئی نسخہ ایران میں نہ تھا''۔

واضح رہے کہ یہ پانچ روزہ جشن ۲/تا ۶/اکتوبر ۱۹۳۴ء میں منایا گیا تھا۔

سید صاحب نے زیر نظر مکتوب میں اپنی تصنیف خیام کے بارے میں لکھا ہے کہ مکتوب الیہ کی خدمت میں اس کا ایک نسخہ ارسال کیا جا چکا ہے۔ دوسرا نظر ثانی کے بعد بھیجا جائے گا۔ اب جنوری ۱۹۳۷ء کے شذرات کی یہ سطریں ملاحظہ کیجیے:

> ''اس (فارسی ترجمے) کے لیے تقاضا تو ایک سال سے تھا، مگر دوبارہ نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کے خیال سے ابھی تک تعمیل نہیں کی گئی۔ گذشتہ ''رمضان'' کی فرصت اس ''بادہ خوار'' کے سوانح پر نظر ثانی کی نذر ہوئی جس نے سرخوش ہوکر کہا تھا:
>
> ماہِ رمضاں برفت و شوال آمد ہنگامِ نشاط و عیش و قوال آمد
>
> اور اضافہ کے بعد اب یہ نسخہ کابل بھیجا جا رہا ہے''۔

یہ تقاضا دراصل سرور خاں گویا صاحب کی جانب سے تھا۔ وہ جب جشن فردوسی میں شرکت کے لیے ایران گئے تھے تو وہاں سید صاحب کی مذکورہ کتاب کا چرچا رہا تھا اور یہ فرمائش کی گئی تھی کہ اس کا

---

* افسوس اب تک یہ خط دارالمصنّفین کے ذخیرۂ خطوط سے نہ مل سکا۔

فارسی ترجمہ جلد شائع کیا جائے، جیسا کہ سید صاحب نے انھی شذرات میں لکھا ہے۔ ایران سے واپسی کے بعد گویا صاحب نے سید صاحب کو خط لکھا مگر وہ ضائع ہوگیا۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ذریعے پیغام بھیجا تو سید صاحب نے ایک نسخہ فوراً کابل ارسال کیا اور ایک سال بعد ''نسخۂ مصححہ بنظر ثانی'' روانہ کیا۔

گویا صاحب نے ۱۹۴۲ء میں جب سنائی کے خطوط شائع کیے تو ایک خط عمر خیام کے نام بھی تھا۔ اس کی تمہید میں انہوں نے سید صاحب کا تذکرہ بطور خاص کیا:

> ''اول کسے کہ ازین نامۂ تاریخی متذکرہ گردیدہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی است کہ در کتاب بہ نام خیام نوشتہ اند، ایں مطلب راذکر نمودہ...''۔ (مکاتیب سنائی تصحیح نذیر احمد، تہران، ص ۳۸)

اس کے بعد خیام کے اس نسخے کا ذکر ہے جو سید صاحب نے مکتوب الیہ کو ارسال کیا تھا اور اس کے حاشیے پر ان کے قلم سے جابہ جا اضافے تھے۔

سید صاحب کے اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں قیاس یہ ہے کہ یہ جولائی یا اگست ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا ہوگا۔ جون ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سفر افغانستان سے واپس آئے تھے اور حسب وعدہ سید صاحب نے ستمبر کے شذرات میں مکتوب الیہ کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے خط کی تحریر کا زمانہ انھی دونوں مہینوں کے درمیان ہوگا۔

آخر میں ایک تجویز یہ ہے کہ اس طرح کے نادر خطوط جب معارف میں شائع ہوں تو ساتھ ہی ان کا عکس بھی چھاپا جائے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ خدانخواستہ اصل خط کسی سبب سے ضائع ہوجائے تو کم از کم اس کا عکس محفوظ رہے۔ اس خط کی تمہید میں فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ بعض مقامات پر عبارت سمجھ میں نہ آسکی تو وہاں سوالیہ نشان ڈال دیا گیا ہے۔ عکس ہوتا تو ممکن ہے قارئین معارف میں سے کوئی صاحب علم ان مقامات کو پڑھنے میں کامیاب ہوجاتے۔ سید صاحب کا یہ نادر مکتوب چونکہ دارالمصنّفین ہی میں محفوظ ہے اس لیے گزارش ہے کہ میرے اس مراسلے کے بعد ہی سہی اس کا عکس شائع کردیا جائے۔*

---

* یہ خط بھی تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکا۔

یہ سطریں لکھ چکا تھا کہ مولانا مسعود عالم ندوی کے نام سید صاحب کے ایک خط میں دارالمصنّفین کے رجسٹر مراسلات کا ذکر نظر گزرا جس میں مرسلہ خطوط کی نقلیں ہوتی تھیں تا کہ اگر کوئی خط ڈاک کی نذر ہوجائے تو مکتوب الیہ کو اس کی نقل دوبارہ بھجوائی جاسکے۔سید صاحب کا یہ فارسی مکتوب بھی شاید اسی رجسٹر سے نقل کیا گیا ہو اس لیے کہ اصل خط تو مکتوب الیہ کو بھیجا گیا ہوگا۔اس رجسٹر میں مکتوب الیہ کا نام بھی درج ہوگا اور خط کی تاریخ بھی۔اگر آپ نے اس رجسٹر سے رجوع کر کے مولوی ابوطلحہ نعمت ندوی صاحب کے مضمون پر معارف کی جانب سے ایک نوٹ میں یہ وضاحت کردی ہوتی تو مجھے اس خامہ فرسائی اور قیاس آرائی کی ضرورت نہ پڑتی۔خیراب یہ زحمت فرمائیں اور رجسٹر دیکھ کر میرے خط پر یہیں ایک نوٹ لکھ دیں۔*

والسلام

محمد اجمل اصلاحی

مکتوب لکھنؤ

شعبۂ اردو۔
مانو،لکھنؤ کیمپس

مکرمی ومحترمی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

معارف کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔شذرات میں آپ نے علاءالدین خلجی سے متعلق گمراہیوں اور غلط فہمیوں کا جس طرح پردہ چاک کیا ہے وہ قابل داد ہے۔شذرات کی دانش ورانہ اور علمی سطح سب پر ظاہر ہے،اس شمارے نے اسے مزید بلند کردیا ہے۔علامہ شبلی نے اس طرح کی بعض تاریخی گمراہیوں کا پردہ چاک کیا تھا۔سرسید نے جب تاریخی اغلاط کی درستی کے لیے ایک صیغہ قائم کیا تو اس کا سکریٹری علامہ شبلی کو بنایا تھا۔ماہنامہ معارف کا امتیازی وصف تاریخ وتحقیق کی درستی ہے،جس کی ایک نہایت عمدہ مثال تازہ شمارہ کے شذرات ہیں،جس نے اس تاریخی تسلسل کو قائم رکھا ہے۔اس کے لیے آپ بجاطور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

معارف ایک علمی اور تحقیقی رسالہ ہے۔اس میں شائع ہونے والی تحریروں کا مطالعہ اس لحاظ

---

* اب یہ رجسٹر ہے نہ اس کی کوئی خبر۔

سے بھی کیا جاتا ہے کہ ان میں حوالوں اور حواشی کا کس درجہ اہتمام کیا گیا ہے۔تازہ شمارہ میں پروفیسر الطاف احمد اعظمی کے علاوہ کسی نے اس کی پابندی نہیں کی ہے۔

ڈاکٹر رفیق قاسمی نے اپنے مضمون ''اسلام میں آزادی فکر و عمل'' میں حوالوں کا اہتمام نہیں کیا ہے۔مضمون میں جو احادیث نقل کی گئی ہیں ان کے حوالے کے طور پر صرف حدیث کے مجموعے کا نام لکھا گیا ہے۔ڈاکٹر نذیر بٹ کے یہاں بھی حوالے مکمل نہیں ہیں۔اخبار علمیہ میں پہلی خبر کے علاوہ کسی بھی خبر میں صفحہ نمبر کا اندراج نہیں ہے۔جن اخبارات کے متعدد ایڈیشن نکلتے ہیں ان کے حوالے میں ایڈیشن کا بھی اندراج ہونا چاہیے۔روزنامہ انقلاب اور اخبار مشرق کے ایک سے زائد ایڈیشن ہیں۔ دارالمصنّفین کے اسکالر مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی نے ''تلخیص و ترجمہ'' میں کسی بھی عربی عبارت کا حوالہ نہیں دیا ہے۔کتاب ''تاریخ دعوت و عزیمت'' سے جو عبارت انہوں نے اپنے مضمون میں نقل کی ہے، اس کے حوالے میں مطبع اور سال اشاعت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ڈاکٹر محمود مرزا کے خط سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ''سفرنامہ روم و مصر و شام'' کے کس ایڈیشن سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔سفرنامہ کے پہلے اقتباس کا حوالہ نہیں ہے۔اسی طرح صفحہ ۱۴۹ (تیسرا پیراگراف) پر بھی سفرنامہ کی ایک عبارت کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔''معارف کی ڈاک'' یہ کالم معارف میں شائع شدہ تحریروں سے متعلق ہوتا تھا۔شاید یہ نئی طرح ڈالی گئی ہے کہ اس میں دیگر موضوعات پر بھی کچھ وضاحت پیش کی جاسکتی ہے۔

معارف میں اگر حوالوں، حواشی اور کتابیات کا اہتمام نہیں ہوگا تو آخر کہاں ہوگا۔سرسید نے شبلی کی مشہور تصنیف ''المامون'' کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ لکھا تھا۔اس کی چند سطریں اس موقع پر بطور یاددہانی درج کی جاتی ہیں:

> ''مصنف نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس کا حوالہ معتبر آخذ سے نہ دیا ہو۔ہر ایک جزوی بات پر بھی اس کتاب کا، جس سے وہ بات لی گئی، حوالہ دیا ہے۔اس کے حاشیوں پر جس قدر حوالے ہیں، ان کو دیکھ کر اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جانکاہی ہوئی ہوگی اور مصنف کو کتنے ہزاروں ورق تاریخوں کے الٹنے پڑے ہوں گے''۔(شبلی شناسی کے اولین نقوش، مرتبہ ظفر احمد صدیقی۔دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔۲۰۱۶ ص ۳۱۸)

ایک صدی بعد اب ایسی کیا ضرورت آن پڑی ہے کہ ہم ان چیزوں سے دستبردار ہوجائیں۔

عمیر منظر

ادبیات

غزل

جناب جمیل مانوی

وہ غیب دست مری ناؤ کھینے والا تھا
مری شناخت اسی نام کا حوالہ تھا

ہمارے ہوتے ہوئے شہر میں اجالا تھا
پھر اس کے بعد اندھیروں کا بول بالا تھا

سکون قلب کی دولت ، نشاط رزق حلال
یہ وہ خوشی ہے جسے آنسوؤں نے پالا تھا

مرے جنوں نے بچایا مجھے ندامت سے
میں ایک روز کا سلطان ہونے والا تھا

مرا شریک سفر تھا ، کوئی قدم بہ قدم
کسی نے گرتے ہوئے بارہا سنبھالا تھا

نہ جانے کتنا سفر اب بھی اور باقی ہے
میں قافلے کے بھروسے یہ رکنے والا تھا

اکیلا میں تھا گناہوں کے اعتراف کے ساتھ
عذاب سنگ مجھی پہ اترنے والا تھا

خود اپنے پانوکی زنجیر سے الجھتا ہے
جو میرے عہد کی تقدیر لکھنے والا تھا

نقیب وقت کی حیرت تو دیدنی تھی جمیلؔ
کہ میں جو ٹھوکریں کھا کے سنبھلنے والا تھا

مطبوعات جدیدہ

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے: از جناب حبیب الرحمٰن چغانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۷۴، قیمت ۳۰۰روپے، پتہ: مصنف، مریم، ملت روڈ، سول لائنز، دودھ پور، علی گڑھ اور علی گڑھ کے مشہور مکتبے۔

قریب بیس اشخاص کے اس تذکرہ میں ہر شخص گویا اپنی زمین کا آسمان تھا، سرسید، خدا بخش، پروفیسر سید بشیر الدین، عزیز مرزا، مولانا علی میاں، یوسف حسین خاں، حکیم حمید، عبدالکلام، سید حامد، علی سردار، مجروح وغیرہ، ان کے علاوہ وہ بھی ہیں جو نسبتاً کم معروف ہیں جیسے عطا کاکوی، ابن فرید، قیام الدین احمد، ضیاء الدین انصاری، تقی رحیم، مصطفیٰ کمال ہاشمی، رضا مہدی، لیکن علم وادب، تحقیق وتاریخ کے یہ سائبان رفعت ووسعت میں آسمانوں کی یاد دلاتے تھے۔ فاضل مصنف کی خوش بختی ہے کہ چند کے سوا باقی دوسری شخصیتوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا لیکن سید بشیر الدین اور مولانا فضل الرحمٰن گنوری سے زیادہ قربت کی بنا پر ان دونوں کی زندگی کی جیسی مرقع کشی کی گئی، اس سے یہ تصویریں نہایت جاذب نظر اور دلکش ودل نشیں نظر آتی ہیں، مولانا گنوری مصنف کے بڑے بھائی تھے۔ جن کی شفقت ومحبت اور الطاف وعنایات کے ذکر میں معصومیت وسرشاری ہونی ہی تھی۔ لیکن یادوں کی کچھ لہریں ایسی بھی اٹھی ہیں جو ساحل سے نظارہ کرنے والوں کو اب بھی بلا خیز نظر آسکتی ہیں، نواب اسماعیل خاں کے بعد ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ یہ صرف ذمہ داریوں کا تغیر وتبدل نہیں تھا، بلکہ تقسیم ملک کے عین دوران، فکر وعمل اور منصوبوں کی الٹ پھیر کا نقیب بھی تھا، اس کا ذکر مصنف نے اس جملہ سے شروع کیا کہ ''ذاکر صاحب کے دور میں یونیورسٹی کی تاریخ نئی طرز پر رقم ہوئی'' آگے اس طرز نو کی چند جھلکیاں ہیں اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، ایک اور مضمون مولوی عزیز مرزا پر ہے، وہی عزیز مرزا جو حیدرآباد میں علامہ شبلی کے پہلے میزبان تھے، مجموعہ محاسن تھے، شاید اسی لیے حیدرآباد میں محسود ہوئے، کبھی محمود گاواں پر کتاب لکھی تھی اور درباری سازشوں کا ایک حیرت وعبرت انگیز سماں دکھایا تھا، گردش لیل ونہار نے وہی منظر خود ان کے سامنے پیش کردیا، عزیز مرزا پر ایک مفصل مضمون کی ضرورت تھی، اس کتاب نے اس ضرورت کو بھی پورا کردیا، سید بشیر الدین علی گڑھ میں لائبریرین تھے، لیکن محض لائبریرین نہیں بلکہ بقول مصنف ''دیوقامت لائبریرین''، علم کتاب داری میں وہ ایک نمونہ ومثال بن گئے۔ ان پر مفصل ومکمل مضمون

سے ایک بڑا حق ادا ہوگیا، باقی مضامین بھی اسی طرح افادیت و معلومات سے پُر ہیں، خاص بات مصنف کا اسلوب تحریر ہے جس میں معصومیت، تحیر اور تحفظ اپنے معانی بکھیرتے نظر آتے ہیں، سادہ انداز لیکن بڑا پرکار، دوسروں کے خاکوں میں خود خاکہ نگار کے رنگ ایسے ابھرتے ہیں کہ پس منظر میں خود اسی کی تصویر ابھرتی جاتی ہے۔ سوانحی کتابیں بے شمار ہیں، یہ کتاب ان میں اپنا شمار کرا جاتی ہے۔

سرسید اور اردو زبان و ادب: از پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد گرد پوش، صفحات ۱۴۴، قیمت ۲۰۰/روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ یوپی۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۹ء میں آیا تھا، ۲۰۱۷ء کا یہ طبع جدید ہمارے پیش نظر ہے۔ قریب ستائیس سال پہلے کہا گیا تھا کہ سرسید پر حالی تا حال کافی کام ہوا لیکن تلاش و جستجو کی گنجائش بہرحال ہے، تب یہ سوال اس کتاب کے وجود کا سبب بنا تھا کہ سرسید نے اردو زبان و ادب کو کیا دیا؟ آج بھی جب کہ سرسید کی خدمات یاد کرنے اور دہرانے کی باتوں سے ایک عالم پرشور ہے، اس کتاب کے مباحث تازہ اور کارآمد ہیں۔ فاضل مصنف مشاق صاحب قلم ہیں، ثبوت ان کی قریب بیس کتابیں ہیں، ان کی تحریروں میں ایک تحقیقی شان ہے اور وہ یہ کہ وہ ثانوی مآخذ پر اعتماد اور نقل در نقل کی جگہ، بنیادی مآخذ سے استفادہ کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے اخذ کردہ نتائج میں ایک پہلو زور اور قطعیت کا بھی ملتا ہے، مثلاً سرسید کے تعلق سے ان کا کہنا ہے کہ ''وہ اپنے دور میں اردو کے سب سے بڑے محسن، خیر خواہ اور دلدادہ تھے''۔ اس متن کی تشریح میں انہوں نے مستند مراجع سے جو بیانات نقل کیے ان میں سرسید کی وفات سے صرف نو دن پہلے کا وہ مضمون بہت اہم ہے جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا، قریب سوا سو سال بعد سرسید کا یہ استدلال اردو والوں کے لیے اب اور زیادہ پڑھنے کے لائق ہے کہ ''اردو زبان میں اخبار اور کتابیں اور رسالے کثرت سے چھپتے ہیں تو یہ کافی ثبوت اس بات کا ہے کہ عام زبان اور عام حروف جو ملک میں رائج ہیں وہ اردو زبان اور اردو حروف ہیں''۔ مصنف کا خیال ہے کہ سرسید سے پہلے اردو ادب موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے کم مایہ تھا، اب یہ کم مائیگی زمانہ اور خود اردو کی عمر کے لحاظ سے تھی یعنی فطری تھی یا غیر فطری؟ یہ سوال اپنی جگہ لیکن یہ درست ہے کہ سادہ اور عام فہم زبان کو مقبول عام و خاص بنانے میں سرسید کی کوششیں، اولیت کا استحقاق رکھتی ہیں۔ رموز اوقاف میں سرسید نے نشانوں کی پابندی پر یہ کہتے ہوئے غالباً پہلی بار زور دیا کہ اس سے جملوں کی ابتدا

وانتہا،لفظوں کی ترتیب، بیان کا تیور اور لہجے کا اتار چڑھاؤ واضح ہوتا ہے،البتہ قدیم شاعری کی لفاظی،مبالغہ، صنائع وبدائع اگر سرسید کی نظر میں حد سے زیادہ معیوب تھے تو اس کا مطلب نظم جدید کی حمایت سمجھنا زیادہ صحیح نہیں، حالی والی نظم کو آج کی نظم جدید سے کیا واسطہ؟ سرسید کے اسلوب نگارش،تصور شعر و ادب، سائنٹفک سوسائٹی، بحیثیت صحافی جیسے اور بھی مضامین ہیں اور یہ سب بدلائل ثابت کرتے ہیں کہ سرسید نے گیسوئے اردو کو سنوارنے کا غیر معمولی کام انجام دیا۔سرسید کے ہر مطالعہ میں اس کتاب کی شمولیت ضروری ہے۔

اتالیق بی بی، ایک تعارف ایک جائزہ: از ڈاکٹر انور حسین خاں،متوسط تقطیع،عمدہ کاغذ وطباعت،صفحات ۸۸، قیمت ۵۰/روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ اور لکھنؤ کے مشہور مکتبے نیز عمران علی آبادی، چھوٹا محل، قصبہ علی آباد، ضلع بارہ بنکی۔

یہ انشائیے ہیں یا فکاہیے ہیں یا پھر افسانے ہیں،جن کا مرکزی موضوع شوہر و بیوی کی وہ باتیں ہیں جو ایک بدلتے ہوئے معاشرہ،نظریہ اور اخلاقی اقدار کی دنیا اپنے اندر سموئے ہیں لیکن اصل لطف تو وہ پیرایہ بیان ہے جس کے لیے کبھی چودھری محمد علی ردولوی معروف وممتاز تھے، کہتے ہیں کہ وہ ذاتی زندگی میں بڑے زندہ دل،ظریف بلکہ دل لگی باز تھے، اودھ کے قدیم قصبات کی ثقافت کا وہ کامل نمونہ تھے،لیکن ان کے کمالات کے اعتراف میں کوتاہی بھی عجب ہے اور ثابت کرتی ہے کہ کمال اور شہرت لازم وملزوم نہیں،مولانا دریابادی کی سند ہے کہ اتنی شستہ، سلیس، بامحاورہ، نستعلیق زبان کم ہی لوگ لکھ سکتے ہیں،مولانا مرحوم کو بھی علم تھا کہ چودھری صاحب کی کئی کتابیں تھیں اور یہ سب کی سب گمنامی میں رہ گئیں،زیر نظر کتاب بھی اسی میں شامل ہے اس کو دریافت کرنے،تعارف کرانے،ضروری حواشی دینے کی توفیق ڈاکٹر انور حسین خاں کو ملی جو خود بھی اگلی شرافت کی دلکش تصویر ہیں۔کتاب کا اصل رس تو بس پڑھنے ہی سے ملے گا،ممکن نہیں کہ شروع کرنے والا ختم کیے بغیر اس کو خود سے الگ کردے، چودھری صاحب نے وہ کردار منتخب کیے جو بجا طور پر ایک عہد کی تہذیبی روایت کے کردار تھے،ڈاکٹر شارب ردولوی نے صحیح لکھا کہ یہ کتاب ایک ایسا البم ہے جس کی تصویریں کہیں اور ملنا ممکن ہی نہیں، کتاب کے مدون ومرتب نے حق ادا کردیا کہ اس کتاب میں کئی مٹ جانے والے الفاظ و محاورات اور اب نامانوس الفاظ کی فرہنگ بھی دے دی،ڈاکٹر شارب ردولوی اور ڈاکٹر طارق ایوبی کی دلچسپ اور مفید تحریریں بھی حاصل کرلیں، کتاب کا لطف اب بھی عام ہے لیکن اودھ کے قصباتیوں کے لیے یہ ایسے قصہ پارینہ سے کم نہیں جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ کاش کوئی اسے ڈھونڈھ کر لائے۔ ع۔ص

رسید کتب موصولہ

انبیاء کی سرزمین۔ اُردن و فلسطین: محمود الرحمٰن فاروقی ندوی، فرید بک ڈپو لمٹیڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔۲۔ قیمت=/۱۰۰ روپے

بحر زخار (جلد اول): شیخ وجیہ الدین اشرف، مترجم مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، کمال بک ڈپو، شمس العلوم گھوسی، مئو۔ قیمت=/۶۰۰ روپے

تجربات (مجموعہ نظم): روشن منیش گوالیاری، روشن منیش، پنڈت وہار کالونی، گولے کا مندر، گوالیار ۴۷۴۰۰۵۔ قیمت=/۱۵۰ روپے

تفہیم و تعبیر: پروفیسر خالد محمود، B-20، پاکٹ A-9، ڈی ڈی اے فلیٹ، جسولہ وہار، نئی دہلی۔ قیمت=/۲۳۸ روپے

فضائل نبوی شرح شمائل النبیؐ: شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ تحقیق و تعلیق مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری، جامعہ اسلامیہ، مظفر پور، اعظم گڑھ۔ قیمت درج نہیں

سیرت رسولؐ: ابن قتیبہ دینوری، مترجم طلحہ بن ابو سلمہ ندوی، ادارہ ترجمہ و تالیف، سرسید احمد روڈ، کولکاتا۔ قیمت درج نہیں

کلیسا۔ یورپ کی مذہبی و اخلاقی تاریخ: محمد نفیس خاں ندوی، ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی۔ قیمت=/۳۰۰ روپے

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ عبقری شخصیت: ڈاکٹر رفعت سلطان، باب العلم پبلی کیشنز، شبستان اپارٹمنٹ، سیکنڈ فلور سید فتح علی اسٹریٹ، عیدگاہ ہلس، بھوپال۔ قیمت=/۴۰۰ روپے

مولانا احتشام الدین اصلاحیؒ حیات و خدمات: محمد دانش اصلاحی، اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔ قیمت=/۱۲۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	150/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
April 2018 Vol - 201 (4)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

شبلی صدی مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دار المصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	شذرات سرسید	پروفیسر اصغر عباس	500/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۸۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۹۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۱۰۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۱۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۲۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۳۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۴۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۵۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۶۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۷۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۸۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-
۱۹۔	الفاروق (ہندی)	علامہ شبلی نعمانی	450/-
۲۰۔	الندوہ (جلد ۱۔۴)		2175/-
۲۱۔	الندوہ (جلد ۵۔۹)		زیر طبع